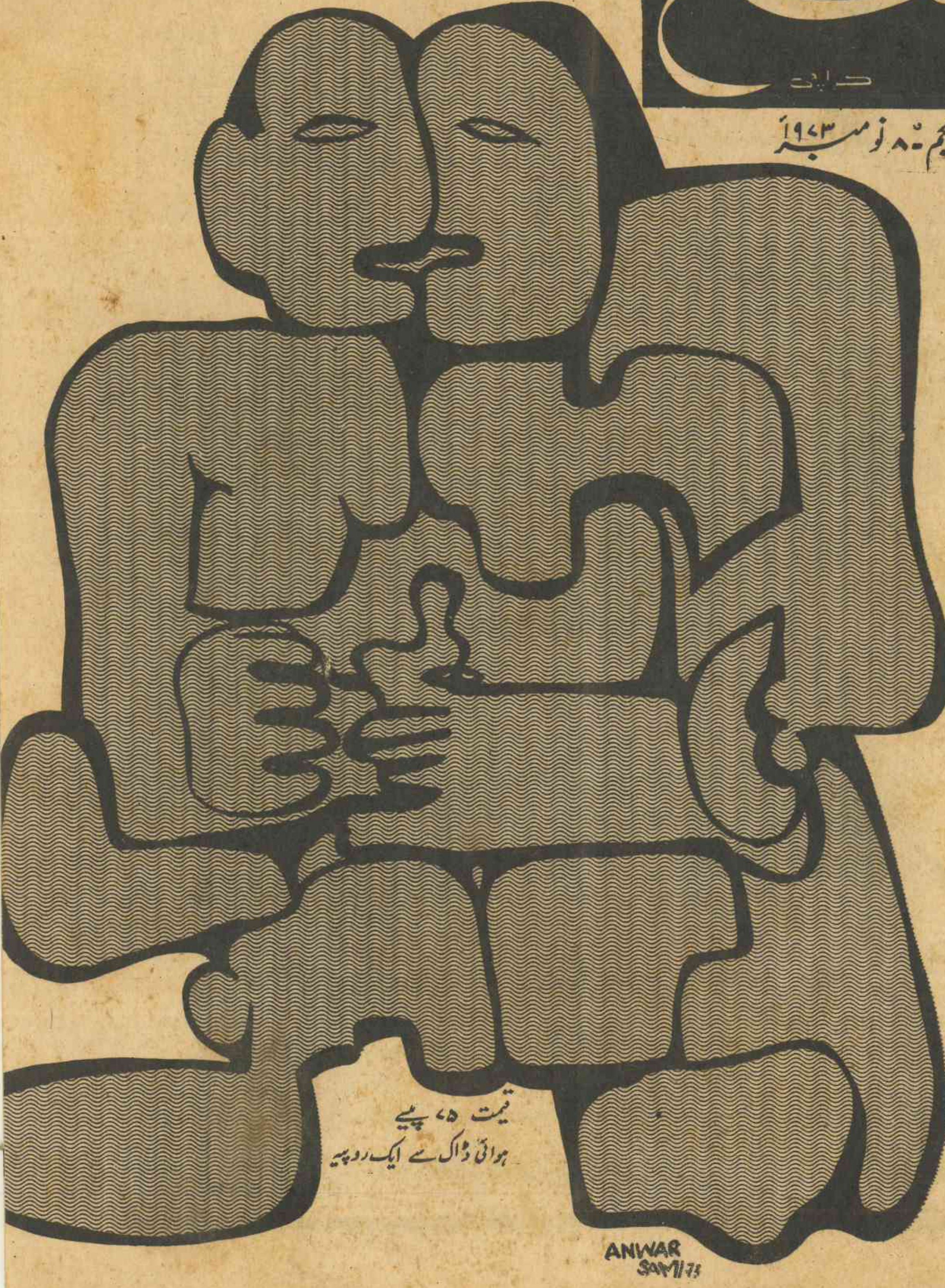
ہفت روزہ

الفتح

کراچی

یکم۔۸ نومبر ۱۹۷۳ء



قیمت ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

عید کارڈ



سیّد محسن نقوی - ایم اے

یہ "عید کارڈ" یہ گل رنگ تہنیّت نامہ
یہ آنچلوں کی طرح شوخ ریشمی کاغذ
یہ نکہتوں سے مہکتا، گلاب گوں پرچم
یہ آئینوں سے بھی نازک یہ شبنمی کاغذ

یہ بے نقاب جبیں پر رقم نقوشِ وفا
یہ چوڑیوں کی کھنک سے لطیف تر باتیں
یہ ابروؤں کی کمانوں پہ رقص کرتے حروف
یہ گیسوؤں کی دھنک میں لچکتی سوغاتیں

یہ میرے حق میں تری دل نشیں تمنّائیں
یہ "صد ہزار برس زندگی" کی نیک دُعا
بجھی بجھی ہوئی آنکھوں سے قہقہوں کی طلب
پیامِ صبحِ مسرت بدستِ شامِ عزا!

نہ پوچھ کیسی لگی ہیں تری دعائیں مجھے!
کہ جیسے جلتی زمیں پر گھر آئے ابر کوئی
وگرنہ میں تو خود اپنے ہی گھر میں تنہا ہوں
کہ جیسے شہر سے باہر فسردہ قبر کوئی

نہ پوچھ اب کے برس کیا قیامتیں گذریں
"کہ عکسِ حلقۂ ماتم" خوشی کے رنگ میں ہے
میں کیا کہوں مری بہنیں سہاگ مانگتی ہیں
میں کیا کروں، میرا بھائی محاذِ جنگ میں ہے

میں لکھ رہا ہوں تجھے شکریئے کے چند حروف
انہیں سنبھال کے رکھنا، یہ میرے خواب بھی ہیں
انہی میں رقص کناں ہیں مری وفا کے کنول
انہی میں تیری وفا کے حسیں گلاب بھی ہیں

میں تجھ سے "عید" ملوں یا تجھے بھلا ڈالوں!
کئی دنوں سے انہی وسوسوں میں کھویا ہوں
ابھی خیال جو آیا تری ——— جدائی کا!
میں "عید" کو بھی "محرّم" سمجھ کے رویا ہوں

خدا کی مظلوم بستی کے
عوام کا ترجمان

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

یکم تا ۸ نومبر ۱۹۷۳ء
قیمت : ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

اداریہ

ہفت روزہ
الفتح
جلد :- ۴ شمارہ :- ۲۵

احتساب

وزیر اعلیٰ سندھ جناب ممتاز علی بھٹو نے وزیر اعلیٰ پنجاب ملک معراج خالد کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا ہے کہ پیپلز پارٹی کے تمام کارکن اور وزراء اپنے اثاثے ظاہر کریں۔ جناب ممتاز بھٹو نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنے اثاثے رضاکارانہ طور پر ظاہر کرنے کیلئے تیار ہیں تاہم یہ کام قومی سطح پر ہونا چاہیئے اور ان اثاثوں کی تحقیقات کے لئے ایسے افراد کو نامزد کیا جائے جو کسی دباؤ میں نہ آسکیں۔

حکمران جماعت کے ایک وزیر اعلیٰ کی تجویز اور دوسرے وزیر اعلیٰ کی جانب سے اس کا خیر مقدم ایک اچھا شگون ہے، اپنے آپ کو محاسبے کے لئے پیش کرنا خاصے دل گردے کا کام ہے اور پھر اس حالت میں جبکہ وزیر اور وزرائے اعلیٰ تو بڑی بات ہے، حکمران جماعت کے عام کارکنوں کے بارے میں عوام شاکی ہوں اور جگہ جگہ یہ باتیں سنائی دے رہی ہوں کہ کل کیا تھے، آج کیا ہوگئے، ان کے تو دن پھر گئے، دونوں ہاتھ سے لوٹ رہے ہیں، پلاٹ الاٹ کراتے ہیں اور اپنے لئے بنگلے اور کاریں خریدتے ہیں، دستخط تک کرنے نہیں آتے مگر دو نئی گاڑیوں کے مالک بن گئے ہیں۔

ایک طرف الزامات کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف حکمران جماعت کے دو وزراء اعلیٰ بڑی ذاخدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ وزیر اعظم بھٹو اسے عملی جامہ پہنانے میں تاخیر سے کام نہ لیں۔

خاص مضامین

سرورق
انور سمیع

تزئین
ذیب

فون ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح ۸/۷ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا۔

ظاہر ہے کہ پہلی بار اس کے نتائج حوصلہ افزا ثابت نہ ہوں گے، ہمارا معاشرہ جن اجزائے ترکیبی کا مظہر ہے، اس میں سے با اختیار ایک فی صد افراد بھی ایسے نہیں جو بدعنوانی تو کجا اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں، فرض کیجئے کہ آپ کو کسی شخصیت پر شبہ ہے کہ وہ بدعنوانیوں کا شکار ہے، آپ اس سے پوچھیں گے تو وہ صاف کہے گا کہ حضور یہ الزام مجھ پر لگا رہے ہیں، دراصل بدنام آپ کو کرنا چاہتے ہیں، ایک بات بھی ثابت ہو جائے تو پھانسی پر لٹکا دیجئے، یہ اکاؤنٹ بکس حاضر ہیں، میں تو اُلٹا مقروض ہو گیا ہوں۔

ان حالات میں وزیروں اور گورنروں یا پارٹی کے کارکنوں سے یہ توقع رکھنا عبث ہو گا کہ وہ صحیح صحیح حساب کتاب پیش کر دیں گے تاہم ایک اچھی روایت کی بنیاد پڑ جائے گی اور نیک نیتی سے عمل جاری رہا تو اس کے نتائج بھی اچھے ثابت ہوں گے، شروع میں وزیر اعظم اپنی کابینہ کے تمام ارکان کو ہدایت کریں کہ وہ اندرون ملک اور بیرون ملک اپنے اثاثوں کا اعلان کریں، اس موقع پر یہ واضح کر دیا جائے کہ جو اصحاب اپنے اثاثے چھپانے کی کوشش کریں گے، وہ خفیہ اثاثوں کی ملکیت سے محروم ہو جائیں گے، صوبائی سطح پر وزرائے اعلیٰ وزیر اعظم کی تقلید کریں اور مناسب سمجھیں تو اپنے وزیروں کے لواحقین کے اثاثوں کی فہرست بھی مرتب کروالیں۔

وزیروں اور پارٹی کے کارکنوں کے بارے میں عوام کی جانب سے جن شک و شبہات کا اظہار ہو رہا ہے، اس اقدام سے نہ صرف شبہات کی روک تھام میں مدد ملے گی بلکہ نوکر شاہی نے بدعنوانیوں کے نئے ریکارڈ قائم کرنے کے لئے جو کوششیں تیز کر دی ہیں ان پر کاری ضرب لگے گی، عالم یہ ہے کہ چنیسر گوٹھ کی ایک بیوہ زیتون بی بی کی نوجوان لڑکی سلطانہ دن دہاڑے اغوا کر لی جاتی ہے، زیتون بی بی محمود آباد کے تھانے سے رجوع کرتی ہے رپورٹ نہیں لکھی جاتی، یہ خاتون تھانے کے بار بار چکر کاٹتی ہے لیکن شنوائی نہیں ہوتی، آخر اخبارات میں اپنی بپتا شائع کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو انسپکٹر جنرل پولیس سندھ تک رسائی کے امکانات جنم لیتے ہیں اور پھر محمود آباد پولیس رپورٹ درج کرتی ہے اور وہ بھی غلط۔ اس بیوہ خاتون کا حکومت کے علاوہ کوئی یار و مددگار نہیں، اس کی نوجوان بچی تین ماہ سے غائب ہے، اسے تلاش کرنے میں پولیس کیوں ناکام رہی ہے، کون سا ہاتھ اس کی بچی کی بازیابی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے، کسی کی ہوس یا دولت یہ ایک غریب بیوہ کی داستان ہے، اس نے وزیر اعظم، بیگم نصرت بھٹو، وزیر اعلیٰ سندھ اور ہر صاحبِ اختیار سے رجوع کیا ہے، لیکن سلطان بی بی کا سراغ نہیں ملا،

نوکر شاہی کے اندھیر پن کی یہ واحد مثال نہیں، ہزاروں اور لاکھوں افراد دکھوں کے مارے سسک رہے ہیں، انہیں انصاف صرف اسی صورت میں مل سکتا ہے جبکہ منصف کی گرفت صرف اسی صورت میں سخت گیر ہو سکتی ہے کہ اس پر کوئی شخص انگلی نہ اٹھا سکے اور ہر شخص یہ سوال کر سکے کہ مالِ غنیمت میں سے جو کپڑا تمہارے حصے آیا تھا اس سے تمہارا جبہ نہیں بن سکتا تھا؟ بتاؤ کہ تم نے باقی کپڑا کہاں سے لیا ہے، یا یہ کہ تم مالِ غنیمت میں بددیانتی کے مرتکب ہوئے ہو۔

احوالِ واقعی
واقعیت حالات


کیسنگر برزنیف کے ساتھ


کوسیجن اور صدر انور السادات

عرب اسرائیل

سمجھوتہ کا نیا فارمولہ ٹائم بم ہے

مشرقِ وسطیٰ میں جنگ بندی ہو چکی ہے۔ اسرائیل، مصر، شام اور اردن، جنگ بندی کی قرارداد منظور کر چکے ہیں البتہ تنظیم آزادیٔ فلسطین نے قرارداد کو مسترد کر دیا ہے۔ دوسری جانب دو عالمی وڈیرے امریکہ اور سوویت یونین سیاسی محاذ پر سرگرم عمل ہیں۔ اور مشرقِ وسطیٰ کے نئے نقشہ کو عربوں اور اسرائیل سے منظور کرانے میں مصروف ہیں۔ لندن سے موصولہ خبروں کے مطابق مشرقِ وسطیٰ کا یہ نیا نقشہ ماسکو نے تیار کیا ہے۔ گذشتہ دنوں جب امریکہ کے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر ہنری کیسنگر نے ماسکو کا دورہ کیا تو انہوں نے اس نقشہ پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس نقشہ میں اسرائیل کی موجودہ سرحدوں میں معمولی ترمیم کے بعد اسرائیل کو تحفظ اور سلامتی کی ضمانت دی گئی ہے۔ امریکہ اور سوویت یونین کا منصوبہ یہ ہے کہ عرب ممالک پر دباؤ ڈال کر اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرایا جائے اور اسرائیل کو نہر سویز استعمال کرنے کی بھی اجازت دلوائی جائے۔

اقوامِ متحدہ کی قراردادِ جنگ بندی، تنازعہ کا حل پیش نہیں کرتی، کیونکہ وہ مسئلہ فلسطین کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ اس لئے یہ جنگ بندی کی قرارداد نہ امن کی بلکہ ایسا ٹائم بم ہے جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے جب تک مسئلہ فلسطین حل نہیں کیا جاتا اور فلسطینی عوام کو ان کے غصب شدہ حقوق نہیں دیئے جاتے، اُس وقت تک مشرقِ وسطیٰ میں حقیقی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ اور سوویت یونین دونوں ہی مشرقِ وسطیٰ میں مستقل امن نہیں چاہتے۔ وہ اس خطہ میں "نہ جنگ بندی" اور "نہ امن" کی حالت برقرار رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس علاقے کے تیل اور گرم پانیوں پر ان کی اجارہ داری رہے۔ اس کے علاوہ یہ خطۂ ارض فوجی اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ یہ اجارہ داری صرف اسوقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک مشرقِ وسطیٰ میں نہ جنگ بندی ہو، نہ امن اور اسرائیل کا وجود بھی برقرار رہے۔ برطانیہ نے اسرائیلی ریاست کو اس لئے قائم کیا تھا۔ کہ اسے تیل ملتا رہے اور بحری راستوں پر اس کا قبضہ رہے چنانچہ برطانوی پارلیمانی کے رکن مسٹر ایمری نے اسرائیل کے قیام کی حمایت کرتے ہوئے ۲۴ مارچ ۱۹۳۶ء کو کہا تھا "آج کل جب کہ مدافعت کے مسائل میں ہمارا دماغ الجھا ہوا ہے۔ ہم فلسطین کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے، نہ ہوائی مستقر کے لحاظ سے نہ نہر سویز اور مشرقی بحیرۂ روم کی حفاظت کے خیال سے بلکہ ہندوستان سے ہمارے رسل و رسائل کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے بھی ہم اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مشرقی فلسطین پر تو بحرِ روم تک پٹرول پہنچانے کا انحصار ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ بھی امریکہ کے ذرائع پر ہمیں قابو حاصل رہے گا؟ پٹرول کے ذخیرے اور بحری مرکز دونوں اعتبار سے حیفہ کی اہمیت بہت ہے۔ اگر فلسطین میں ایک ترقی یافتہ اور طاقتور یہودی قوم ہماری ممنونِ احسان



روس نے اسرائیل کو تحفظ اور سلامتی کی ضمانت دیدی

رہے گی تو نتائج یقینی طور پر اچھے اور دور رس ہونگے۔"
جنگِ عظیم دوم کے بعد امریکہ اور سوویت یونین نے اسی غرض سے مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلط قائم کیا اور اسی لئے انہیں اسرائیلی ریاست کے تحفظ اور سلامتی سے دلچسپی ہے۔

سوویت یونین ۔ عربوں کا دشمن

دونوں عالمی طاقتیں، امریکہ اور سوویت یونین عربوں کی دشمن اور اسرائیل کی دوست ہیں، اقوام متحدہ میں چین کے نمائندے مسٹر ہوانگ ہُو نے ۸ اکتوبر کو بالکل صحیح کہا تھا کہ "اسرائیلی توسیع پسندوں کی حوصلہ افزائی میں دو بڑی طاقتوں کا زبردست ہاتھ رہا ہے" امریکی سامراج نے تو اعلانیہ اور کھل کر اسرائیل کا ساتھ دیا، وسیع پیمانے پر اسلحہ دیا اور اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا بھی حکم دے دیا۔ اس کے برعکس عربوں کا نام نہاد دوست سوویت یونین پنجابی فلموں کے وِلن کی طرح "بڑھکیں" مارتا اور ہندوستانیوں کی طرح "اب کے مار کے دیکھ" کی تکرار کرتا رہا۔ اور اسی کردار کو دہرایا جو اس نے جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ادا کیا تھا۔ ۵ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بھی ماسکو نے عربوں کو دھوکہ دیا تھا۔ "لی جرنل ڈی ایجپٹ" (LE JOURNAL D' EGYPTE) نے ۵ جون کی جنگ کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر انکشاف کیا کہ قاہرہ میں مقیم روسی سفیر نے ۵ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے قبل امریکہ اور سوویت یونین کی حکومتوں کا ایک پیغام مصر کے صدر ناصر مرحوم کو دیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ "اگر اسرائیل نے عربوں کے خلاف جارحیت کی، تو امریکہ اور روس عربوں کی مدد کریں گے اور اسرائیلی جارحیت کو روکیں گے"۔ لیکن جب اسرائیل نے حملہ کیا تو دونوں نے عربوں کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ "ہاٹ لائن" پر عربوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے مشورہ کرتے رہے۔

ماسکو نے عربوں کو دی جانے والی فوجی امداد کا بہت پروپیگنڈہ کیا۔ لیکن مصر کے اخبار "الاہرام" کا کہنا ہے کہ سوویت یونین نے عرب ممالک کو "پیشقدمی کے ہتھیار (OFFENSIVE WEAPONS) نہیں دیئے۔ اسی اخبار کے مطابق جب مصر اور شام نے ماسکو سے اعلیٰ جنگی طیارے خریدنے چاہے۔ تو سوویت کمیونسٹ پارٹی کے چیف برزنیف نے انکار کر دیا اور کہا "میں ان طیاروں کی فروخت کے بارے میں مزید اور کچھ نہیں سننا چاہتا، کسی اور موضوع پر بات کریں"۔ ویکلی "عرب ورلڈ" کے مطابق برزنیف نے فوجی امداد دیتے وقت عرب ممالک پر واضح کر دیا تھا کہ یہ ہتھیار اسرائیل کے خلاف استعمال نہیں ہونے چاہئیں۔ مسٹر برزنیف نے کہا تھا "عرب ممالک فوجی حل کے بارے میں سوچیں بھی نہیں کیونکہ اس طرح سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہو جائے گی جس کا نتیجہ عالمی جنگ کی صورت میں برآمد ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ عالمی جنگ چھیڑنے سے عرب کی ترقی پسند حکومتوں کا خاتمہ ہو جائے۔"

اسرائیل کے تحفظ اور سلامتی سے سوویت یونین کی دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسرائیل کو سب سے زیادہ افرادی قوت ماسکو ہی فراہم کرتا ہے۔ صرف ۱۹۷۲ء میں ۳۲ ہزار روسی یہودیوں کو اسرائیل جانے کی اجازت دی گئی۔ اسرائیل جانے والے یہودیوں کو روسی حکومت بڑی مراعات اور سہولتیں دیتی ہے۔ اُن سے تعلیمی ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ ۱۹۷۳ء کے اوائل میں جب مسٹر برزنیف امریکہ کے دورے پر گئے تو انہوں نے امریکی کانگریس کے ۲۰ سے زیادہ ارکان کی موجودگی میں کہا کہ سوویت یونین سے اسرائیل جانے والے ۹۵ فی صد سے زائد یہودیوں کی درخواستیں منظور کر لی گئی ہیں۔ روزنامہ نیویارک ٹائمز کے مطابق "مسٹر برزنیف نے صدر نکسن کو یقین دلایا کہ روسی یہودیوں کی ایک بھاری تعداد جلد ہی اسرائیل جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔"

اب وقت آگیا ہے کہ عرب عوام اپنے دوست نما دشمن کو بے نقاب کر دیں اور سامراج، صیہونیت کے ساتھ ساتھ سوشل سامراج کے خلاف بھی جدوجہد کریں۔

اب کیا کرنا چاہیئے

اب عرب ممالک کو سامراج اور صیہونیت کے خاتمے کے لئے معاشی جنگ کا آغاز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جنگی محاذ پر انہیں اُس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک وہ اسلحہ کے معاملہ میں خود کفیل نہیں ہو جاتے۔ معاشیات اور اقتصادیات ہی سیاست کو کنٹرول کرتی ہے۔ لہٰذا معاشی جنگ بہت ضروری ہے۔ اس لئے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے چاہئیں۔

۱۔ امریکہ اور اسرائیل نواز ممالک کو تیل کی سپلائی بند کر دی جائے۔
۲۔ امریکی تیل کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے۔
۳۔ امریکہ اور برطانیہ کے بنکوں سے عرب ممالک اپنا محفوظ سرمایہ نکال لیں

عرب
سامراج اور
صیہونیت کے
خلاف معاشی
جنگ کا
آغاز کریں

علاجِ نیست

سید عبدالحمید عدم

تجھے یہ علم بھی۔ اے ڈھیٹ سامراج نہیں
کہ جگ میں اپنے کیے کا ــــ کوئی علاج نہیں

گزشتہ سات برس سے ــــ تمام اہلِ جہاں
رہے ہیں مشرقِ وسطےٰ میں ــــ امن کے کوشاں

زمانہ دیتا رہا ہے ــــ ہدایتیں تجھ کو
کہ زیب دیتی نہیں ــــ یہ شرارتیں تجھ کو

پڑوسیوں سے لڑائی ــــ خرد کا کام نہیں
یہ چھین اور جھپٹ ــــ پیشۂ انام نہیں

عرب علاقے ــــ عرب وارثوں کی دولت ہیں
وہ تیرے پاس اگر ہیں تو ــــ اک امانت ہیں

علاقے انکے انہیں پھیر دے ــــ حریص نہ بن
بجا سلوک کا اظہار کر ــــ خسیص نہ بن

بُرے بھلے کا ــــ برابر حساب ہوتا ہے
زیادتی کا نتیجہ ــــ خراب ہوتا ہے

تیری انا نے مگر ــــ تیری سوجھ گم کر دی
تیرے ضمیر میں ــــ بدلیوں کی تیرگی بھر دی

○

تری تباہی کی بھٹی ــــ ہوتی ہے گرم اگر
تو کھل کے ــــ فخر و مباہات کی نمائش کر

کسی طرح کا بھی افسوس ــــ اک زبوں شے ہے
تری خوشی تو فقط ــــ اقتدار کی لے ہے

یہ روزِ بد جو ــــ ترے دیکھنے میں آیا ہے
یہ تیرے اپنے ہی ــــ حسنِ عمل کا سایا ہے

جواب آں غزل

منہاج برنا

شیخ حامد محمود

جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے

برادرم وہاب صاحب!

"الفتح" میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین جناب حامد محمود صاحب کا مکتوب نظر سے گزرا اور اس پر آپ کا حاشیہ بھی جس میں آپ نے مجھ سے چیئرمین صاحب کے "الزامات" کا جواب دینے کے لئے کہا ہے۔

چیئرمین صاحب نے خط دراصل اپنی خفت مٹانے کے لئے لکھا ہے۔ انہوں نے اے پی این ایس کے صدر جناب میر خلیل الرحمٰن صاحب، سی پی این ای کے صدر جناب مجید نظامی صاحب، پی ایف یو جے کے صدر اور سیکرٹری جنرل، اور ٹرسٹ کے تمام اخبارات کے ایڈیٹروں کے سامنے یہ وعدہ ۱۴ ستمبر کو کیا تھا کہ اگر حریت، مہران اور جسارت پر سے پابندی دو دن کے اندر یعنی ۱۶ ستمبر تک نہ اٹھائی گئی تو وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جائیں گے۔ پی ایف یو جے نے ان کی اور دو گھنٹے کے بعد وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی کی اس یقین دہانی کے بعد ہی اپنی ۱۵ ستمبر کی ہڑتال ملتوی کی تھی۔ اس کی بنیاد پر میر خلیل الرحمٰن صاحب، مجید نظامی صاحب اور میں نے اپنی اپنی تنظیموں کی طرف سے ایک مشترکہ اعلان میں اس یقین و اعتماد کا اعلان کیا تھا کہ "تینوں اخبارات پر سے پابندی دو روز کے اندر اٹھالی جائے گی۔" شیخ حامد محمود اور ٹرسٹ کے جملہ ایڈیٹروں یعنی خواجہ آصف صاحب، سلطان احمد صاحب، ظہیر بابر صاحب اور اقبال زبیری صاحب کی موجودگی میں خود جناب وزیر اطلاعات نے بھی اس کے بیان کی توثیق کی تھی۔ اور یہ بات بھی ساری دنیا پر الم نشرح ہے کہ کم از کم ۱۷ ستمبر کی شام تک نہ وزیر اطلاعات نے اس بیان کی تردید کی اور نہ شیخ صاحب نے۔ آج بھی میں شیخ صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مجید نظامی صاحب، میر خلیل الرحمٰن صاحب اور ٹرسٹ کے جملہ ایڈیٹروں سے یہ کہلوا دیں کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین نے ۱۴ ستمبر کو غیر مشروط طور پر یہ یقین نہیں دلایا تھا کہ "تینوں اخبارات پر سے پابندی دو دن کے اندر اٹھالی جائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔"

دراصل ٹرسٹ کے چیئرمین صاحب کا طریق استدلال یہ ہے کہ وہ پہلے تو اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ایک مفروضہ بناتے ہیں اور پھر اس پر ایک خیالی عمارت کھڑی کر لیتے ہیں اور دوسروں سے اصرار کرتے ہیں کہ اُسے تسلیم کر لیں۔ یہ بات کہ وہ ۲۲ ستمبر کو ہڑتال کرنے پر تیار تھے۔ ان کا اپنا مفروضہ ہے کہاں نیشنل پریس ٹرسٹ کا چیئرمین اور کہاں ہڑتال۔ اُن کا کام ہڑتال کرانا نہیں بلکہ ہڑتال تڑوانا ہے جسے انہوں نے ۱۹ ستمبر کو بحسن و خوبی انجام دینے کی کوشش کی۔ یادش بخیر، گذشتہ سال یونس سعید صاحب کو مولانا کوثر نیازی نے ٹرسٹ کی چیئرمینی کے عہدہ سے اسی بنیاد پر ہٹوایا تھا کہ انہوں نے روزنامہ "سن" پر پابندی کے خلاف پی ایف یو جے کی ۲۴ جولائی ۱۹۷۲ء کی ملک گیر ہڑتال میں مداخلت کرنے یا اُسے توڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور مولانا کو یہ بات بہت ناگوار گزری تھی، چنانچہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنی مساعیٔ جمیلہ سے یونس سعید صاحب کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا اور اس کے بعد ہی شیخ حامد محمود صاحب کو ٹرسٹ کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔

اس ضمن میں ہفت روزہ "آؤٹ لک" کے اس مضمون کا حوالہ یہاں بے جا نہ ہوگا جس میں فرضی مضمون نگار "بزرجمہر" نے مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں شیخ حامد محمود کے مخالفین یعنی پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر خواجہ آصف اور پاکستان ٹائمز ہی کے سفارتی امور کے نامہ نگار جناب ایچ کے برکی اور وزیر اعظم کے مشیر خاص جناب یوسف بُچ کے "ہاتھوں" میں کھیل رہا ہوں اور یہ کہ میں نے ۱۹ ستمبر کی ہڑتال محض وزیر اطلاعات اور شیخ حامد محمود کو بے روزگار کرانے کے لئے کرائی تھی۔ اس کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آج تک خاکسار نے نہ کسی کو اپنا آلۂ کار بنایا اور نہ کسی کا آلۂ کار بنا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ میاں "بزرجمہر"، خود شیخ حامد محمود اور وزیر اطلاعات کا آلۂ کار بنے ہیں اور انہوں نے مذکورہ مضمون قلمبند کر کے شیخ صاحب اور کوثر نیازی صاحب کی دستگیری فرمائی ہے۔ بزرجمہر کے توسط سے شیخ صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا یہ مفروضہ صحیح ہے کہ ۱۹ ستمبر کو ملک گیر ہڑتال انہیں اور وزیر اطلاعات کو ان کے عہدوں سے برطرف کرانے کے لئے کی گئی تھی تو پھر شاید یہ مفروضہ بھی صحیح ہو کہ گذشتہ سال ۲۴ جولائی کی ہڑتال پی ایف یو جے اور میں نے یونس سعید صاحب کو برطرف کرانے اور حامد محمود صاحب کو چیئرمین بنوانے اور مولانا کوثر نیازی کی نوکری پکی کرانے کے لئے کرائی تھی۔

چیئرمین صاحب پر یہ واضح ہونا چاہیئے۔ پی ایف یو جے یا اس کے عہدہ داروں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وزیر اطلاعات، وزیر اطلاعات رہتے ہیں یا نہیں

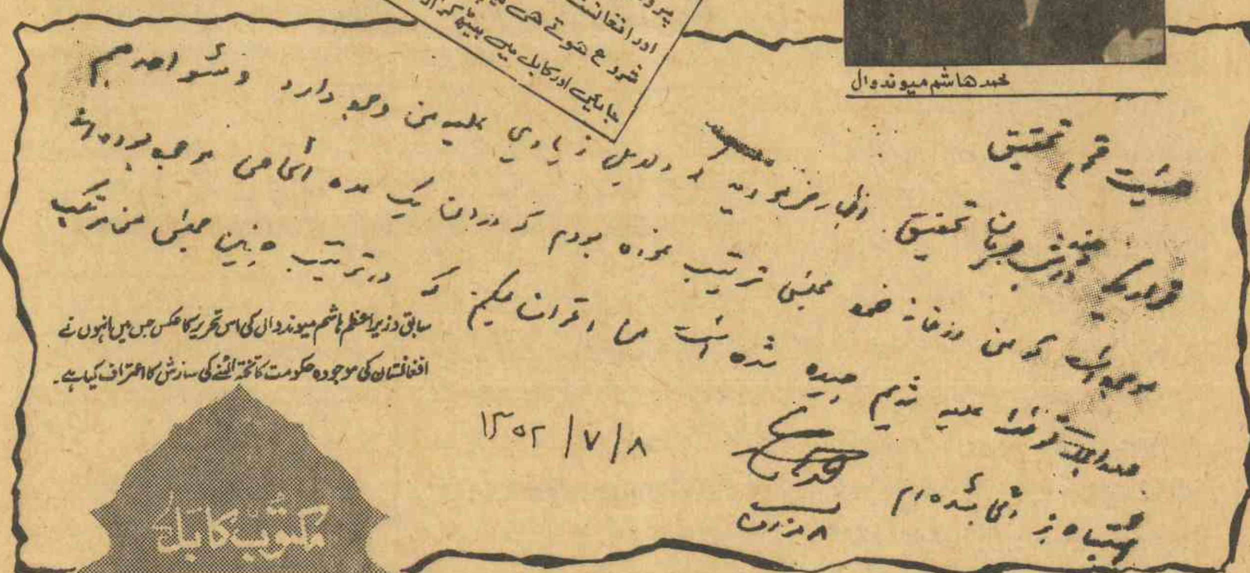
باقی صفحہ ۳۱ پر



محمد ہاشم میوندوال

اجمل خٹک نے کہا "محبت جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے"

پروگرام یہ ہے کہ پاکستان
اور افغانستان کے درمیان محاذ آرائی
شروع ہوتے ہی نیپ کے لیڈر افغانستان پہنچ
جائیں اور کابل میں بیٹھ کر آزاد پختونستان کی تحریک چلائیں


۱۳۵۲ / ۷ / ۸

سابق وزیر اعظم ہاشم میوندوال کی اس تحریر کا عکس جس میں انہوں نے افغانستان کی موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا اعتراف کیا ہے۔

مکتوبِ کابل
ندیم

سابق وزیر اعظم ہاشم میوندوال کی خودکشی معمہ بن گئی

خدا کے غضب سے ڈرو، داؤد

"لوگو! کہتا ہے کہ میرے شوہر نے پاکستان کے ساتھ مل کر اپنے ملک سے غداری کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس اس بغاوت کے ثبوت موجود ہیں، کہاں ہیں یہ ثبوت؟ یقین کرو! یہ ساری باتیں جھوٹ ہیں۔ ہم سب کو ایک دن اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ میرے شوہر کو قتل کر کے اب یہ کہا جا رہا ہے کہ اس نے خودکشی کر لی۔ اگر اس نے خودکشی کی تھی تو پھر ہمیں اس بات کی اجازت کیوں نہیں دی گئی کہ ہم اپنے ڈاکٹروں سے اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرائیں۔؟ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرے شوہر سردار داؤد اور ہم سب کی طرح محب وطن تھا۔ اسے قید خانے میں اذیتیں دے دے کر مار ڈالا گیا ہے۔ اسے مار مار کر یہ بات تسلیم کرائی گئی ہے کہ وہ پاکستان کا ایجنٹ ہے۔ یہ کیسا اندھیر ہے۔؟ سردار داؤد کی آمریت کے سامنے سر نہ جھکانے والوں کو دن دہاڑے قتل کیا جاتا ہے اور آپ خاموش ہیں۔ میری مدد کیجئے خدا کے لئے میرے بچوں پر ترس کھایئے۔ میرے شوہر کے قاتلوں کو ان کے کئے کی سزا دلوایئے۔"

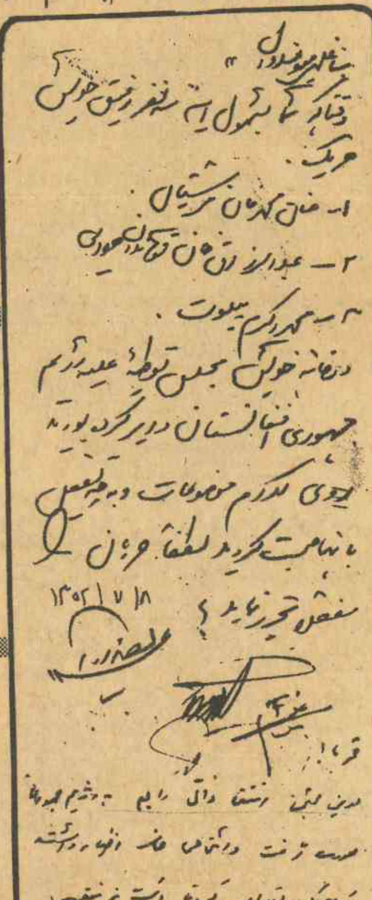
یہ الفاظ افغانستان کے سابق وزیر اعظم ہاشم میوندوال کی بیوہ کے ہیں۔ ہاشم میوندوال کا حال ہی میں افغانستان کے ایک قید خانے میں انتقال ہو گیا۔ حکومت افغانستان نے ان کے انتقال پر یہ خبر نشر کی کہ انہوں نے جیل میں خودکشی کر لی۔ اس سلسلے میں ان کے اس اعتراف کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں اخباروں میں شائع کی گئیں جن میں انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ افغانستان کی موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں وہ شریک تھے۔ مرحوم ہاشم میوندوال کی بیوہ ایک دن اچانک کابل کے ایک چوراہے پر نکل آئیں۔ انہوں نے ایک بہت بڑے ہجوم سے خطاب کیا اور اپنے شوہر کے قتل پر سے پردہ اٹھایا۔ بعد میں افغان فوجیوں نے انہیں گھیر لیا اور انہیں نامعلوم مقام کی طرف لے گئے۔ لیکن ان کی اس جرأت سے کم از کم افغانی عوام کو پہلی بار اس بات کا علم ہو گیا کہ ان کے سابق وزیر اعظم نے

اذیتیں دے کر ہاشم میوندوال سے اعتراف جرم کرایا گیا؟

خودکشی نہیں کی بلکہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں افغانستان میں ہر جگہ ہاشم میوندوال کے چرچے ہیں۔ سردار داؤد کی آمریت کے شکنجے اب کچھ اور سخت ہو گئے ہیں۔ فوج اور پولیس حق بات کہنے والوں کی سرکوبی میں لگی ہوئی ہے۔ افغانستان کی جیلیں سیاسی قیدیوں سے بھری جا رہی ہیں۔

جمہوریت کا قتل عام

افغانستان میں جمہوریت کے نام پر معصوم افغانی عوام کو خوب بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ موجودہ حکومت کا کوئی بھی ایسا قدم نہیں ہے جسے جمہوری نظام سے قریب سمجھا جائے۔ تحریر و تقریر پر پابندی عائد ہے۔ اخبارات سرکاری کنٹرول میں ہیں، مخالف سیاسی پارٹیوں کا کوئی وجود نہیں، ملک میں عام انتخابات کی کوئی بات نہیں کرتا تمام سرکاری محکموں کے سربراہ فوجی افسر ہیں۔ جن لوگوں کو حال ہی میں افغانستان کی موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ انہیں اذیتیں دے دے کر آہستہ آہستہ قتل کیا جا رہا ہے پہلے ہاشم میوندوال کو قتل کیا گیا۔ اب ایک قبائلی سردار کو قتل کئے جانے کی افواہ گرم ہے۔ اس بارے میں سرکاری طور پر کوئی اعلان نہیں کیا گیا لیکن زبان خلق کو اگر نقارۂ خدا سمجھ لیا جائے تو اب تک اس سازش میں شریک کئی لوگوں کو قتل کیا جا چکا ہے۔ ان پر جھوٹے مقدمات دائر کر دیئے گئے ہیں۔ جن کا فیصلہ فوجی عدالت کرے گی اور فوجی عدالت کے فیصلے کا سب کو پہلے ہی سے علم ہے۔



ہاشم میوندوال کی تحریر کا ایک عکس جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ان کے ساتھ کون کون سازش میں شریک ہے۔

محمد ہاشم میوندوال
کے سابق وزیراعظم کی لاش کا
پوسٹ مارٹم کرنے کی اجازت
نہیں دی گئی!

پختونستان کا ڈھونگ

جب سے افغانستان کی قسمت کی باگ ڈور سردار محمد داؤد کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ پختونستان کے مردہ تن میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یوں تو افغانستان کے سابق بادشاہ ظاہر شاہ کے زمانے میں بھی ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے آزاد پختونستان کی خوب پبلسٹی کی جاتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ ظاہر شاہ کو اس اسٹنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بھارت اور روس کے دباؤ میں آکر شاہ ظاہر شاہ کو اس معاملے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانی پڑتی تھی۔ روس اور بھارت اس سلسلے میں عملی اقدامات کے خواہاں ہیں۔ اب سردار محمد داؤد کے زمانے میں ان کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔ روس اور بھارت آزاد پختونستان کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے افغانستان کو وقتاً فوقتاً کثیر رقوم فراہم کرتے ہیں۔ یہ رقوم سرحدی علاقوں کے قبائلی سرداروں میں تقسیم کی جاتی ہیں جس کے صلے میں یہ قبائلی سردار آئے دن پاکستان کیخلاف بیانات دیتے ہیں اور یہ بیانات ریڈیو افغانستان سے بڑے اہتمام کے ساتھ نشر کئے جاتے ہیں۔ روس کا ایک فوجی وفد ان دنوں افغانستان کے دورے پر آیا ہوا ہے افواہ گرم ہے کہ رمضان شریف کے مہینے کے بعد افغانستان اپنی سرحدوں پر پاکستان سے عملی چھیڑ چھاڑ کرنے والا ہے۔ حکمت عملی وہی ہوگی جو بنگلہ دیش کے سلسلے میں اپنائی گئی تھی۔ پروگرام یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوتے ہی نیشنل عوامی پارٹی کے سارے لیڈر فرار ہو کر افغانستان پہنچ جائیں گے اور یہاں سے آزاد پختونستان کی ساری سرگرمیوں کو کنٹرول کریں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روس آخر آزاد پختونستان کی اتنی حمایت کیوں کر رہا ہے۔ تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اس کی نظریں گوادر کی بندرگاہ پر ہیں۔ اگر یہ بندرگاہ اس کے دائرۂ اثر میں آ گئی تو پھر اس علاقے کے تمام سمندر پر اس کی اجارہ داری قائم ہو جائے گی۔

نیپ کی حمایت

نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ ولی خان پر مبینہ قاتلانہ حملہ کیا ہوا کہ ریڈیو افغانستان کو جیسے بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اس نے اپنی خبروں اور تبصروں میں علی الاعلان کہنا شروع



کر دیا کہ پاکستان کے وزیر اعظم جناب بھٹو اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹانے کے پروگرام پر عمل درآمد کر رہے ہیں ولی خان پر حملہ انہوں نے ہی کرایا ہے لیکن "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر" ہے کہ وہ بچ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کو اپنے لیڈروں سے زیادہ نیپ کے لیڈروں کی صحت کی زیادہ فکر ہے۔ اگر نیپ کے کسی لیڈر کو خدانخواستہ کبھی چھینک بھی آجائے تو یہ خبر اخبارات اور ریڈیو کی سرخی بن جاتی ہے۔ ریڈیو افغانستان دنیا کی خبریں نشر کرتا ہے لیکن پاکستان کے بارے میں صرف ایسی خبریں نشر کی جاتی ہیں، جن میں پاکستان کی تضحیک کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ یا جن سے پاکستان کو درپیش مسائل کا اظہار ہوتا ہے۔ پاکستان کے بارے میں کوئی اچھی خبر آپ ریڈیو افغانستان سے کبھی نہیں سن سکتے۔ البتہ نیپ کی چھوٹی سے چھوٹی خبر فوراً نشر کی جاتی ہے۔ پاکستان میں وزیر اعظم بھٹو کی آمریت کا رونا رویا جاتا ہے پختونوں کو آزادی کا درس دیا جاتا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے اغراض و مقاصد پر بحث کی جاتی ہے۔ اس کے لیڈروں کی درازی عمر کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ہر ہفتے یا پندرہ روز کے بعد نیپ کے مفرور سیکرٹری جنرل جناب اجمل خٹک کی تقریریں ریڈیو افغانستان سے نشر کی جاتی ہیں جن میں اجمل خٹک پاکستان کے خلاف اپنے ترکش کے ہر تیر کو استعمال کرتے ہیں اجمل خٹک صاحب کو مجھ سے گلہ ہے کہ میں نے ان کے انٹرویو کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ انہوں نے یہ انٹرویو بڑی تفصیل سے دیا تھا۔ لیکن بقول ان کے میں نے کئی باتیں جان بوجھ کر حذف کر دیں۔ اب انہیں یہ کون بتائے کہ موجودہ حالات میں یہ باتیں حذف کر دینا ہی عقلمندی تھا۔ اگر زندگی ہوئی تو یہ

سردار داؤد کے مخالفین کو دن دہاڑے قتل کر دیا جاتا ہے

باتیں پھر کبھی لکھوں گا۔ فی الحال میں ان کا یہ انکشاف یہاں ضرور درج کروں گا، کہ محبت، جنگ اور سیاست میں سب باتیں جائز ہوتی ہیں۔ انہوں نے یہ جملہ اس وقت کہا جب میں نے جناب ولی خان پر مبینہ قاتلانہ حملے کے بارے میں ان سے سوال کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ولی خان پر یہ حملہ بھٹو صاحب نے کرایا ہے۔ میرا کہنا تھا کہ بھٹو صاحب کو ولی خان سے کیا خوف ہے؟ بھٹو صاحب کو پاکستان کے قلب یعنی پنجاب کے عوام کی حمایت حاصل ہے اور جب تک یہ حمایت باقی ہے، انہیں کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ اس پر اجمل خٹک صاحب ہنس کر کہنے لگے تو پھر مقبول ہونے کے لئے ولی خان نے اپنے پر خود ہی حملہ کرایا ہو گا کیونکہ محبت، جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔

لاقانونیت

آپ کو یہ پڑھ کر حیرت ہو گی کہ افغانستان میں کوئی قانون نہیں ہے۔ جس کی جو مرضی آتی ہے، کرتا ہے۔ کابل کے قریب حال ہی میں ایک قاتل نے اپنے دشمن کو قتل کر کے اس کی لاش کی بوٹی بوٹی کی اور انہیں کتوں کو کھلا دیا لیکن بعد میں یہ قاتل خون بہا دے کر "باعزت طور" پر بری ہو گیا اس سلسلے میں ایک اور مثال دی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں میری ملاقات ایک جرمن تاجر سے ہوئی جو کسی ضروری کام کے سلسلے میں ان دنوں کابل آیا ہوا ہے۔ ایک روز اس نے بتایا کہ وہ اپنی کار میں کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں سے

روسی فوجی وفد' افغان حکام کے ساتھ کابل کے ہوائی اڈے پر



لوگوں کا ایک جمگھٹا نظر آیا۔ صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے وہ اپنی کار سے نیچے اتر آیا۔ معلوم ہوا کہ کسی شخص کی کار کے نیچے آکر کوئی بچہ ہلاک ہو گیا ہے۔ یہ جرمن تاجر ابھی پوری طرح سے حالات سے باخبر بھی نہیں ہوا تھا کہ لوگوں نے اسے یہ کہہ کر پکڑ لیا کہ یہ بچہ تمہاری کار کے نیچے آکر ہلاک ہوا ہے۔ اس نے ہزار اپنی صفائی پیش کی لیکن کسی نے اس کی نہیں سنی۔ بعد ازاں یہ جرمن تاجر ڈیڑھ لاکھ افغان ہرجانہ دے کر رہا ہوا۔

افغانستان میں بعض لوگوں کا پیشہ یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کار سے اپنا حادثہ کروا دیتے ہیں اور پھر ایک معقول رقم کے عوض کار کے مالک کو چھٹکارا نصیب ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایک دو بار اس قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں۔

سڑکوں پر شاید ہی کوئی ڈرائیور ٹریفک سگنلوں کی پابندی کرتا ہے۔ یک طرفہ راستوں کے قانون کی، پابندی بھی شاذ و نادر ہی کی جاتی ہے۔ آپ کسی بھی محکمے میں چلے جائیں، آپ کو ہر کلرک اور افسر یہ کہتا ہوا نظر آئے گا کہ یہاں ہمارا قانون چلتا ہے۔

حال ہی میں ریڈیو افغانستان سے ایک خبر نشر ہوئی کہ افغانستان کی مختلف جیلوں میں کم و بیش ۱۰ ہزار ایسے قیدی موجود ہیں جن پر گذشتہ دس بارہ سال سے کوئی مقدمہ ہی نہیں چلا اور یہ بغیر اپنی سزا سنے قید خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں مقید ہیں۔ ان کے مقدمات کے بارے میں اب قانونی چارہ جوئی کی جا رہی ہے۔

THE KABUL TIMES

Abortive attempt on Khan Wali Khan scorned

KABUL, Oct. 16, (Bakhtar).— The recent abortive attempt on the life of National Awami Party Khan Abdul Wali Khan has been scorned by all opposition parties of Pashtunistan and Pakistan.

According to information received this ill-move has further aggravated the political situation in the region.

Apart from the National Awami Party, parties of Pashtun and Baluch university students, Jamiate Ulemai Islam, Tahrike Isteqlal, and the United Republican Front also condemned the attempt against Wali Khan's life. These parties have expressed their deep abhorrence of the action.

In central occupied Pashtunistan and in some parts of Pakistan the action spurred demonstrations and meetings which are still continuing. They consider the action as part of a plan to eliminate opposition political leaders

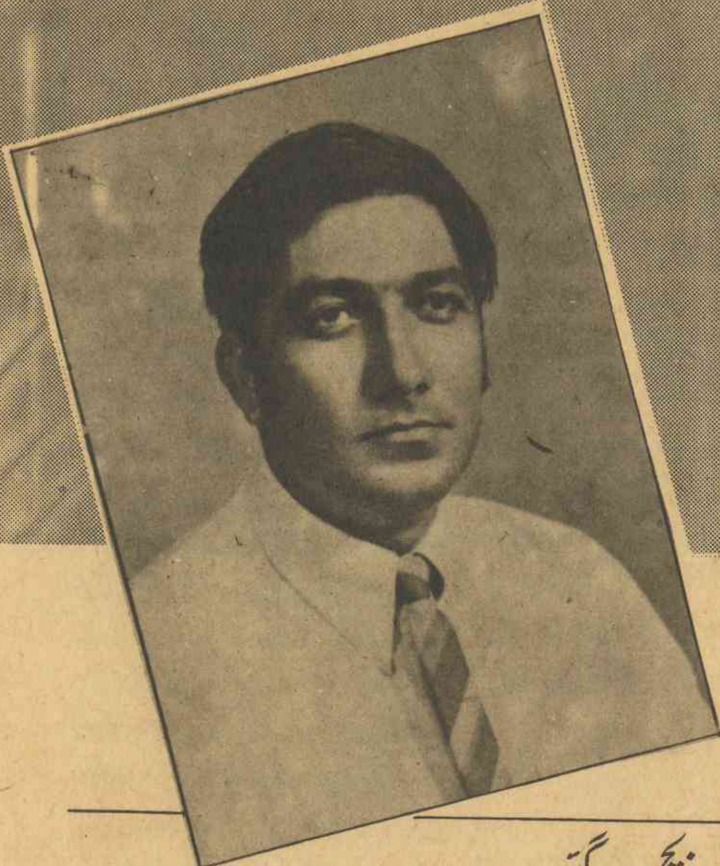
ریڈیو افغانستان اور افغانستان کے اخبارات کو نیپ کے لیڈروں سے کتنی دلچسپی ہے اس کا اندازہ آپ کو کابل ٹائمز کے ان تراشوں سے ہو جائے گا۔

Attempt on life of Wali Khan condemned

KABUL, Oct. 16, (Bakhtar)— Mia Mohammad Yaseen Uto, one of the leaders of Muslim League Party in a press conference has called explicity on the Pakistan government to refrain from undesirable activities against the Republic in Baluchistan and southern Pashtunistan. He said that the government should seek ways to solve the political issues in the region and release all prisoners of the region from the prisons. The leader of Muslim League Party condemned the recent attemptt on the life of Khan Abdul Wali Khan and described the move as inhuman and antipolitical.

پکڑ لو

یہی داؤد سبحانی ہے



جناب داؤد سبحانی پچھلے ماہ بھارت کی قید سے رہا ہو کر وطن پہنچے ہیں۔ جناب سبحانی کا شمار ملک کے صفِ اول کے صحافیوں میں ہوتا ہے انہوں نے کئی بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر صحافتی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ یہی فرض بنگلہ دیش میں ان کے لئے قید و بند کی طویل صعوبتوں کا موجب بنا۔ الفتح اپنے اس ساتھی کی یادداشتیں پیش کر رہا ہے۔ (ادارہ)

اعجاز الرحمان روسی صحافی بن کر بچ گئے

۱۴ دسمبر سے انٹرکانٹی نینٹل ڈھاکہ میں مقیم تمام مغربی پاکستانی عملاً نظر بندی کی حالت میں تھے۔ ۱۴ دسمبر کو ہی ڈاکٹر مالک اور چیف سیکرٹری مظفر حسین سیاسی پناہ لینے کے لئے انٹرکانٹی نینٹل میں پہنچ گئے۔ پورے ڈھاکہ میں مختلف قسم کی افواہیں تیزی سے گشت کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنی جگہ مضطرب اور پریشان تھا۔ انٹرکانٹی نینٹل کے انتظامات ریڈ کراس کے سپرد تھے۔ ان کے پاس صرف چار افراد تھے جو یقیناً ناکافی تھے۔ ریڈ کراس والوں نے ہوٹل میں مقیم غیر ملکی صحافیوں سے اپیل کی کہ وہ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ غیر ملکی صحافیوں کی متعدد کمیٹیاں بنا کر ان کے ذمہ کام لگا دیا گیا۔"

داؤد سبحانی سقوط ڈھاکہ کی تفصیلات بتا رہے تھے انہوں نے رک کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "عجیب دن تھے، عجیب حالات تھے۔ غیر ملکی صحافی مغربی پاکستانیوں سے سخت بغض رکھتے تھے۔ وہ اپنے ہر عمل سے ہمارے جذبات کچلنا چاہتے تھے۔ چونکہ ریڈ کراس کی جانب سے انہیں ہوٹل کے انتظامات کے اختیارات حاصل ہو چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے ہمارے آنے جانے پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ڈاکٹر مالک اور چیف سیکرٹری مظفر حسین جب ہوٹل میں داخل ہوئے تو ان کی باقاعدہ تلاشی لی گئی۔ کپڑوں کو جھاڑ جھاڑ کر دیکھا گیا۔ ایک سوٹ کیس سے پستول برآمد ہوا۔ تلاشی لینے والا غیر ملکی صحافی انتہائی ہتک آمیز رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے چیخا۔ "بتاؤ یہ کس کا ہے۔ ورنہ سخت سزا دی جائے گی۔"___ مظفر حسین کے ٹیلیفون کا تار کاٹ دیا گیا۔ وہ ایک جگہ ٹیلیفون کرنا چاہتے تھے، لیکن انہیں اجازت نہ دی گئی۔ انہیں گالیاں دی گئیں، ایک دوسرے غیر ملکی صحافی نے بڑے زور سے چلا کر کہا۔ "تم لوگوں کا دماغ ٹھیک کر دیا جائے گا۔" میں اپنے ایک دوست کو ٹیلیفون کر کے اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے بھی اجازت نہ دی گئی۔ اس طرح مغربی پاکستانی نیوٹرل زون میں ۱۴ دسمبر سے عملاً نظر بندی کی حالت میں تھے۔ اس دوران غیر ملکی صحافیوں نے جو ہمارے لئے اچھے جذبات نہ رکھتے تھے گن گن کر بدلہ لیا۔

ائیرپورٹ کے علاقہ میں بھارتی طیاروں کی بمباری

۴ دسمبر کو ہوائی حملے کا سائرن بجا، اس کے ساتھ ہی فضا میں بھارتی طیارے نمودار ہوئے۔ اور تباہ کن بمباری شروع کر دی۔ اس بار بھارتی طیاروں نے ائیرپورٹ کے علاقہ کو اپنا نشانہ بنایا۔ جہاں پی آئی اے کے اسٹاف کے لوگ مقیم تھے۔ بمباری سے اسٹاف کے کئی افراد شہید ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد خطرہ ٹلنے کا سائرن بجا اور

ڈاکٹر مالک اور مظفر حسین کی تلاشی لی گئی

غیر ملکی صحافیوں نے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل پاکستانیوں کے لئے جہنم بنا دیا

I..

Nationality.................

Passport or I.D.No.............issued at....

on.................

hereby declare that

(a) I am awaiting evacuation from Pakistan

(b) I am not in possession of any arms or ammunition or other Military equipment

(c) I have renounced all Governmental activity whilst I am registered as a resident of this Neutral Zone and I am playing no part whatsoever in the conflict.

(d) I am willing to submit myself to all instructions issued by the International Red Cross whilst I am under its protection

(e) I have been residing in the Hotel-Continental Hotel prior to 17.00 p.m. on 9 December 1971.

Signature..............................

Dacca, Dec.1971.

Total family members:.............

ریڈ کراس کی انٹرنیشنل کمیٹی جنیوا کی جانب سے جاری ہونے والا فارم

ہمیں اس حادثہ کی خبر ملی۔ اس وقت ہوٹل میں پی آئی اے کے ایک اعلیٰ افسر موجود تھے۔ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ وہاں جاکر حالات معلوم کریں، اور بمباری سے شہید ہونے والوں کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کریں مگر انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور جنازے کی نماز میں بھی شرکت نہ کی، بلکہ ہوٹل میں شراب و کباب سے اپنا دل بہلاتے رہے۔

ریڈ کراس والوں نے اچانک اطلاع دی کہ ہمیں ۱۹ ردسمبر کو ہوٹل سے ڈھاکہ کنٹونمنٹ منتقل کر دیا جائے گا۔ اس میں خاصی رازداری سے کام لیا گیا تھا۔ تاکہ مکتی باہنی کے رضاکاروں کو یہ خبر معلوم نہ ہو سکے۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ اگر مکتی باہنی والوں کو ہماری منتقلی کی بھنک بھی لگ جاتی تو وہ کسی راستے میں اچانک حملہ کر دیتے۔ وہ ہمارے خون کے پیاسے تھے میں نے بڑی خاموشی اور احتیاط سے ہر اس کمرے میں جہاں مغربی پاکستانی مقیم تھے، دستک دی اور ان سے کہا کہ روانگی کے لئے تیار رہیں۔ رات بھر میں ان لوگوں کے ناموں کی فہرست تیار کرائی گئی، جنہیں کنٹونمنٹ منتقل ہونا تھا۔ گھبراہٹ اور پریشانی کا یہ عالم تھا کہ ہوٹل میں کھانا پکانے والے مغربی پاکستانیوں کے نام فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئے۔ چنانچہ فہرست میں ان کے نام شامل کرانے کے لئے اچھی خاصی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ کنٹونمنٹ میں منتقلی سے قبل میں ہوٹل کے کاؤنٹر پر پہنچا۔ جہاں ایک نوجوان بنگالی بیٹھا ہوا تھا۔ میں پوربانی ہوٹل میں رضا عباس کو ٹیلیفون کرنا چاہتا تھا۔ رضا عباس ٹیلیویژن میں ملازم تھا۔ میں اس کے حالات معلوم کرنے کے لئے بڑا بے چین تھا۔ بنگالی نوجوان نے بتایا کہ مجھے ٹیلیفون کرنے کی اجازت

پنجابی سکھ نے پنجابی مسلمان کی جان بچالی

نہیں ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بھائی مجھے ایک دوست کی خیریت معلوم کرنی ہے۔ انسانی ہمدردی کے نام پر تم میری مدد کرو۔" وہ تیار تو ہوگیا، مگر اس نے خود میرے بتائے ہوئے نمبر پر ٹیلیفون کیا۔ جب رضا عباس کی آواز آئی تو اس نے ٹیلیفون مجھے دے دیا۔ میں نے رضا عباس کی ڈھارس بندھائی اور اس سے کہا۔ "فکر نہ کرو، میں کسی وقت تمہیں پوربانی ہوٹل لینے آؤں گا۔ تم ہر وقت تیار رہو۔"

۱۹ ردسمبر کو ہمیں ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے ڈھاکہ کینٹ منتقل کر دیا گیا۔ اس اثنا میں میں نے کوشش کی کہ کسی طرح پوربانی ہوٹل پہنچ جاؤں، جہاں ڈھاکہ ٹیلیویژن کے رضا عباس، ظہیر خان، صمد قریشی، حبیب اللہ فاروقی، شاہد نقوی مقیم تھے۔ لیکن مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پوربانی ہوٹل موتی جھیل کے علاقہ میں تھا، جہاں اطراف میں مکتی باہنیوں کا عملاً قبضہ تھا۔

اسی طرح وہاں جانا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ ٹیلیویژن کے دوسرے لوگ محبوب الرحمان، ارباب خان، بدر عالم محمد پور میں تھے اور بعد میں وہ بخیریت ڈھاکہ کنٹونمنٹ پہنچ گئے۔

ہمارا قافلہ بحفاظت تمام ہوٹل سے ڈھاکہ کنٹونمنٹ پہنچ گیا، مجھ سے وہاں نچلا نہ بیٹھا گیا۔ میرا ذہن رضا عباس اور اس کے دوسرے ساتھیوں میں الجھا ہوا تھا، جو پوربانی ہوٹل میں قیامت کے لمحات گذار رہے تھے۔ میں نے کچھ لوگوں سے بات کی، مگر کوئی شخص وہاں جانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اسی درمیان میں میری ملاقات ایک سکھ میجر بیدی سے ہوئی، میں نے پنجابی زبان میں اس سے تمام حالات

کے جی بھائی کے رویّے اور سلوک میں تبدیلی نہیں آئی

بیان کئے۔ اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح ان کی جان بچانے میں مدد کرے۔ پہلے تو وہ تیار نہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس کی ڈیوٹی دوسری جگہ ہے۔ لیکن جب میں نے اس پر زیادہ سے زور دیا تو شاید وہ میری مدد کرنے پر اسی لئے آمادہ ہو گیا کہ میں اس سے پنجابی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس دن مجھے زبان کی طاقت یا جادو کا احساس ہوا۔ اس نے ایک جیپ پر فوجی جوان بٹھائے اور مجھے لے کر پوربانی ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ پوربانی ہوٹل پہنچ کر اس نے فوجی جوانوں کو حکم دیا کہ وہ ہوٹل کو گھیر کر کھڑے ہو جائیں اور کسی کو اندر نہ آنے دیں، پھر وہ مجھے لے کر کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ وہاں میں نے جلدی جلدی رضا عباس کے کمرے میں ٹیلیفون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں بالکل تیار رہے۔ میں اوپر اسے لینے آ رہا ہوں۔ جب میں میجر بیدی کے ساتھ اوپر پہنچا تو رضا عباس اپنے کمرے کے دروازہ پر کھڑا مل گیا۔ اس کا عجیب عالم تھا۔ دہشت اور خوف سے اس کا سارا جسم کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ میں جلدی جلدی اسکا سامان باہر نکالنے لگا۔ میجر بیدی نے کہا۔ "جو سامان لینا چاہتے ہو اپنے ساتھ لے لو۔ تم لوگ بھی کیا یاد کروگے کہ میجر بیدی سے تمہارا واسطہ پڑا تھا۔''

اس طرح میجر بیدی کی امداد سے میں ٹیلیویژن کے رضا عباس اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو پوربانی ہوٹل سے ڈھاکہ کنٹونمنٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔

۳، جنوری کا واقعہ

ڈھاکہ کنٹونمنٹ میں چند عورتوں کے یہاں بچے پیدا ہوئے۔ کنٹونمنٹ میں ایک خاتون مسز کرم علی تھیں۔ وہ انٹر کانٹی نینٹل میں ہاؤس کیپر تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ زچگی کے لئے کچھ کپڑے ادویات، پھل اور خشک دودھ کے ڈبے خریدنے ہیں۔ کیا کیا جائے؟

میں نے ایک کیپٹن سے بات کی، اور اس سے اجازت لے کر ایک جیپ کے ذریعے ہوٹل انٹر کانٹینینٹل پہنچے۔ میرے ساتھ مسز کرم علی، ظہیر خان، اعجاز الرحمان تھے۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ اعجاز الرحمٰن انتہائی گورے چٹے اور دیکھنے میں غیر ملکی معلوم ہوتے ہیں۔ انٹر کانٹینینٹل میں ہمیں مطلوبہ سامان نہیں ملا۔ چنانچہ وہاں سے بیت المکرم پہنچے۔ کمرشل ایریا میں دوا کی ایک دو دکانیں کھلی تھیں وہاں سے ہم نے ضروری دوائیں اور دوسرا سامان خریدا۔ مجھے راستے میں خیال آیا کہ کیوں نہ پریس کلب ہوتا چلوں، کچھ لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ اور تازہ ترین حالات معلوم ہو جائیں گے۔ ڈھاکہ پریس کلب پہنچ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ رکھی، اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں اندر جا رہا ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ بات نظر آئی تو الٹے پیر واپس آؤں گا۔"

پریس کلب کے اندر پہنچا تو وہاں خطرے کی کوئی

> **تم لوگ بھی کیا**
> **یاد کروگے کہ میجر**
> **بیدی سے تمہارا**
> **واسطہ پڑا تھا**

بات نظر نہ آئی۔ جانے پہچانے صحافیوں سے ملاقات ہوئی کے جی مصطفیٰ نے مجھے دیکھ کر گلے لگا لیا۔ انہوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں شکایت کی کہ میرے رہتے ہوئے تم ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہو۔ میرے گھر آ جاؤ۔ تمہیں کسی قسم کی شکایت نہ ہوگی۔'' کے جی بھائی سے مل کر میں بہت خوش ہوا۔ ان کے لہجے میں وہی مٹھاس اور اپنائیت تھی جس کے ہم سب عادی بن چکے تھے۔

پریس کلب سے نکلنے کے بعد میں نے سمت کا اندازہ لگانے میں زبردست غلطی کی اور یونیورسٹی روڈ کی جانب نکل گیا۔ یونیورسٹی روڈ سے آگے نکل کر پیل خانہ پہنچ گیا۔ جس سڑک پر میری جیپ بھاگ رہی تھی، وہ تنگ ہوتی چلی گئی تھی، آخر ایک جگہ سڑک اتنی تنگ ہو گئی، کہ آگے جانا دشوار ہو گیا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں گاڑی کو بیک کرنا شروع کر دیا۔ جب ذرا جگہ کشادہ ملی تو میں گاڑی بیک کر کے دوسری سڑک پر نکل گیا۔ راستے میں ایک جگہ پھل اور سگریٹ والوں کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے اعجاز الرحمان سے کہا کہ وہ سگریٹوں کے چند پیکٹ اور کیلے خرید لے۔ ہم جیپ سڑک کے ایک کنارے کھڑی کر کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ اتنے میں دس پندرہ بنگالی لڑکے جیپ کے قریب پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر سوال کیا: "کیا تم داؤد سبحانی ہو"۔ میرے جواب دینے سے قبل ہی دوسرا نوجوان بول پڑا۔ ہاں ہاں یہ داؤد سبحانی ہے۔ پکڑ لو۔" یہ واقعہ اچانک پیش آیا تھا۔ لیکن میں نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کر دی اور تیزی سے سڑک پر لے آیا۔ اعجاز الرحمان کیلے اور سگریٹ لینے کے لئے دوسری جانب چلا گیا تھا۔ اتنی دیر میں پکڑو، پکڑو، مارو، مارو کے شور سے پورا علاقہ گونجنے لگا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دو سو مسلح بنگالی نجانے کدھر سے نکل کر سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔ میں نے بڑے جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ اس کے باوجود ایک بنگالی نوجوان جیپ پر لٹکا ہوا مجھے باہر کھینچ رہا تھا۔ میں نے کہنی سے زوردار دھکا دیا۔ جس سے وہ نیچے گر گیا۔ میں جیپ کو بڑی تیزی سے بھگا رہا تھا۔ سڑک پر جو بھیڑ جمع تھی، وہ کائی کی طرح پھٹ گئی اور میں ان کے درمیان میں سے ہوا کے تیز جھکڑ کی طرح نکل گیا۔ خطرے سے باہر نکلنے کے بعد ہماری جان میں جان آئی، لیکن اعجاز الرحمان کیلئے ہم سب متفکر تھے۔ میرے دل پر ایک بڑا بوجھ تھا۔ آخر

باقی صفحہ ۲۴ پر

لیاقت علی خاں کے قتل کا منصوبہ برطانیہ نے تیار کیا تھا؟



فضل الٰہی

▼ ہر سال جب ۱۶ اکتوبر آتا ہے، ہر سال جب نوابزادہ لیاقت علی خان کی برسی منائی جاتی ہے۔ تو قومی پرچم سرنگوں ہوجاتے ہیں، پرانے زخم ہرے ہوجاتے ہیں۔ اس سیاسی قتل کی بازگشت گونجتی ہے۔ عوام کی تشویش ایک بار پھر بیدار ہوجاتی ہے، وہ بار بار اس شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ لیاقت علی خان کا قتل ایک گہری سیاسی سازش کا نتیجہ تھا۔ اس سازش پر سے پردہ اٹھایا جائے، مگر یہ پردہ کبھی نہیں اٹھا۔

لیاقت علی کی شہادت، انسانی تاریخ کے لئے کوئی عجوبہ نہیں، سیاسی قتل اور سازشوں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ اس میں مخالفین اور غیر ملکی طاقتوں کے ایجنٹوں کے ہاتھوں سیاسی رہنماؤں اور حکمرانوں کے قتل کے بیشمار واقعات ملتے ہیں۔ ربع صدی میں بے شمار سیاسی رہنما اور حکمران موت کی گھاٹ اتار دیئے گئے، ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو اردن کے حکمران شاہ عبداللہ کو قتل کردیا گیا۔ اسی سال ایرانی وزیراعظم رزمرا کو موت کی گھاٹ اتار دیا گیا تھا ۱۹۵۹ء میں سیلون کے سوشلسٹ وزیراعظم سر بنڈرانائیکے کو ایک برطانوی ایجنٹ نے ہلاک کردیا، ۱۹۶۲ء میں کانگو کے سامراج دشمن بطل حریت اور افریقی عوام کے نجات دہندہ وزیراعظم لومبا کو امریکی سامراج کے رسوائے زمانہ ادارے سی آئی اے نے قتل کروادیا۔ جنوبی ویت نام میں جب امریکہ کو جنرل ڈیم سے زیادہ وفادار افراد مل گئے تو اس نے ۱۹۶۳ء میں فوجی جنرلوں کے ہاتھوں صدر جنرل ڈیم کو مروادیا۔ اسی سال امریکی صدر جان، ایف کینیڈی کو گولی کا نشانہ بنادیا گیا، پھر ان کے بھائی رابرٹ کینیڈی کو موت کی گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں امریکی نیگرو لیڈر ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو قتل کیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۹ء کے دوران عراق، شام، لاطینی امریکہ میں متعدد سیاسی رہنما قتل ہوئے۔

ان رہنماؤں کے قتل کی سازشوں سے پردہ اٹھانے کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن افسوس، لیاقت علی خان کی شہادت کا معمہ حل کرنے کے لئے کوئی مثبت کوشش نہیں کی گئی، لیاقت علی کے ساتھیوں، اعتمادیوں اور جانشینوں پر یہ قومی فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ قائدملت کی شہادت کے

سید اکبر نے کہا ہمارا لیڈر عبدالقی

رازسے پردہ اٹھاتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا چوہدری محمد علی لیاقت علی کے مصاحب خاص تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "پاکستان کا ظہور" میں قائدملت کی شہادت اور اس کے محرکات پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا، اور چوہدری خلیق الزماں نے تو اپنی کتاب میں لیاقت علی کی شہادت کا ذکر کرنا بھی گوارہ نہیں سمجھا۔ بعض پاکستانی ادیبوں اور

> حکومت قاتل کے ورثا کو کن خدمات کے عوض پنشن دیتی ہے ؟

اخبار نویسوں نے پاکستان کی تاریخ پر قلم اٹھایا، انہوں نے بھی قائدملت کی شہادت پر تبصرہ نہیں کیا۔ مثلاً جی، ڈبلیو چوہدری نے "ڈیموکریسی ان پاکستان" میں اس واقعہ پر کچھ لکھنے سے گریز کیا۔ زیڈ۔ اے سلہری اور مشتاق احمد نے لیاقت کے قتل کی سازش پر سے پردہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ لیاقت علی پر کڑی نکتہ چینی کی۔ زیڈ اے سلہری نے اپنی کتاب "پاکستان لاسٹ ڈیز" میں قائدملت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا "انہوں نے پاکستان پر اپنی ذاتی حاکمیت مسلط کرنے کی کوشش کی"۔ مشتاق احمد بھی "گورنمنٹ اینڈ پاکستان" میں لیاقت علی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے لکھتے ہیں "بعض اوقات لیاقت علی نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کئے بغیر اہم فیصلے کئے"۔

ایوب خان جس کی ترقی لیاقت علی کی مرہون منت تھی، جسے انہوں نے کمانڈر انچیف بنایا۔ وہ بھی اپنی کتاب "فرینڈ ناٹ ماسٹرز" میں اپنے محسن سے ہمدردی نہیں کرتا بلکہ نااہل ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

خاںؑ وزیراعلیٰ بننے والا ہے"

مسلم لیگ کے معاملات بڑے الجھے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ ہائی کمان اور ورکنگ کمیٹی کی باگ دوڑ گنتی کے چند لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور پارٹی کا کوئی تنظیمی ڈھانچہ نہیں تھا۔ صوبوں میں جھگڑے بڑھ رہے تھے۔ ادھر لیاقت علی خاں کی طرف سے صورتحال پر قابو پانے میں ڈھیل پیدا ہو رہی تھی، ان کی بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاغذات کو پڑھتے وقت ایک خاص زاویے پر رکھا کرتے تھے ان کے ارد گرد جو لوگ تھے وہ بھی ویسے ہی سست قدم اور قوت فیصلہ سے محروم تھے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کسی امر کا بھی دل جمعی کے ساتھ فیصلہ کر سکے!

حقیقت یہ ہے کہ قائد ملت کی شہادت کے بعد خود غرض وزیروں اور نوکر شاہی نے سکون کا سانس لیا۔ ان کی موت نے نوکر شاہی کے لئے ترقی کے نئے دروازے کھول دیئے۔ کالے بابوؤں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ برطانوی نوکر شاہی کے کل پرزے غلام محمد، چوہدری محمد علی اور مشتاق احمد گورمانی کی بن آئی، غلام محمد گورنر جنرل بن گئے، چوہدری محمد علی نے وزارت خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ غرض کہ ایک سیاسی دنگل شروع ہو گیا جس میں ہر ایک کو زور آزمائی کی کھلی چھٹی تھی۔ اقتدار کے ان بھوکوں نے لیاقت علی خان کی شہادت کی تحقیقات میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں، اور محمد علی بوگرہ کو امریکی ادارے مرکزی جاسوسی ایف بی آئی کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

لیاقت علی خان کے قاتل کے بارے میں حکومت پاکستان نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو جو پریس نوٹ جاری کیا اس میں کہا گیا "لیاقت علی خان مرحوم کے قاتل کی شناخت ہو چکی ہے، وہ سعد اکبر ولد بابرک ہے، اس کی ذات اپر خیل جدران اور قومیت افغان (کھوسٹ علاقہ) ہے۔ سعد اکبر گزشتہ چند سالوں سے سرحد کے ضلع ہزارہ میں مقیم تھا" لیکن حکومت پاکستان نے یہ نہیں بتایا کہ سعد اکبر کیوں اور کب پاکستان آیا۔ افغانستان سے کیوں جلاوطن کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سعد اکبر، اس کے باپ اور چھوٹے بھائی نے افغان حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی جو ناکام رہی، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے برطانیہ کے اشارے پر بغاوت کی تھی، کیونکہ جب سعد اکبر اور اس کے بھائی کو جلاوطن کر دیا گیا اور افغان پارلیمان نے ایک قرارداد کے ذریعے ان کی افغان قومیت ختم کر دی تو وہ ۱۹۴۶ء کے اواخر یا ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ایبٹ آباد میں قیام پذیر ہو گئے۔ انہیں حکومت برطانیہ کی طرف سے پنشن ملتی تھی۔ سرکاری مراعات حاصل تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پنشن حکومت پاکستان دیتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے



یہ مضمون نوابزادہ لیاقت علی خان کی برسی کے موقع پر لکھا گیا تھا لیکن اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں مشرق وسطیٰ میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے، جنگ کے دوران، انتظامیہ نے اپنے تمامتر صفحات فلسطین کے عوام اور عربوں کے کاز کے لئے وقف کر دیئے۔ اس لئے یہ مضمون ۱۶ - اکتوبر کو شائع نہیں کیا جا سکا۔ (ادارہ)

ان کی شہادت کی تحقیقات کو سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔!!

کہ دونوں بھائی حکومت پاکستان کے آرام دہ اور عالیشان بنگلوں میں رہتے تھے۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد بھی سعد اکبر کے ورثا کو پنشن دیتی رہی۔

پاکستان کے بعض ارباب اقتدار اور نوکر شاہی کے اہم کارندوں سے سعد اکبر کے گہرے تعلقات تھے، وہ اکثر و بیشتر ان سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ گورنر سرحد تک اس کی رسائی تھی بھارت کے مشہور صحافی جمنا داس اختر نے سعد اکبر سے اپنی اتفاقیہ ملاقات کا ذکر کیا ہے، جو قیام پاکستان سے قبل جون ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں گورنر ہاؤس پشاور میں ہوئی۔ جمنا داس اختر نے اس ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں گورنر سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اس کی رہائش گاہ پر پہنچا، جو وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ گورنر مسلم لیگ کے معروف رہنماؤں سے گفتگو کر رہے تھے جنہیں حال ہی میں حکومت نے رہا کیا تھا، اس لئے مجھے ایک گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ یہاں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی جس نے سبز رنگ کی قمیص اور خاکی پاجامہ پہن رکھا تھا، اور اس کے کوٹ کی کالر پر جناح کی تصویر والا بیج لگا ہوا تھا، اس نے غلطی سے مجھے مسلم لیگی سمجھتے ہوئے گفتگو شروع کر دی۔ میں نے بھی اس کی غلط فہمی رفع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، میں نے اسے بتایا کہ میں پشاور سے ایک روزنامہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر اس نے کہا کہ "چند ماہ انتظار کرو، ہمارا لیڈر عبدالقیوم وزیر اعلیٰ بننے والا ہے۔ پھر میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکوں گا۔" اس نے بتایا کہ وہ افغانستان کا سیاسی پناہ گزین ہے۔ اسے افغانستان میں اپنے خاندان پر کئے جانے والے ظلم و استبداد کے بارے میں دردناک کہانی سنائی۔ میں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ میں صرف وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جس سعد اکبر سے میں گفتگو کر رہا ہوں وہ ایک دن پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کا قاتل بنے گا۔"

یہ ہے کہ ۱۶ اکتوبر کو مرکزی وزیر خزانہ غلام محمد، امور کشمیر کے وزیر میاں مشتاق احمد گورمانی اور چیف سیکریٹری حکومت پاکستان چوہدری محمد علی راولپنڈی میں موجود تھے، لیکن انہوں نے جلسہ عام میں شرکت نہیں کی۔ اس بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اتنے طاقتور اور مقبول وزیر اعظم کی کابینہ اور حکومت کے تین رکن کسی ٹھوس جواز کے بغیر جلسے سے غیر حاضر رہے۔ حالانکہ یہ جلسہ نہایت اہم تھا اس میں مرحوم وزیر اعظم خارجہ پالیسی کے بارے میں اہم اعلان کرنے والے تھے، اسی دن لیاقت علی کشمیری رہنما چوہدری غلام عباس اور سردار ابراہیم سے ملاقات کرنے والے تھے۔ یہ دونوں حضرات پنڈی میں موجود تھے وزیر اعظم کی شہادت کے بعد سردار ابراہیم نے انکشاف کیا کہ اسے وزیر اعظم کی غیر موجودگی میں برطرف کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ گورمانی نے انہیں برطرف کیا ہوگا، اسی لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ لیاقت علی خان، سردار ابراہیم کی حکومت کو بحال کر دیں۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ غلام محمد، چوہدری محمد علی اور گورمانی، تینوں کا تعلق برطانوی تربیت یافتہ نوکر شاہی سے تھا۔ جب تک یہ برطانوی حکومت کے ملازم رہے۔ تاج برطانیہ کے مفادات کا تحفظ کرتے رہے۔ نہ انہیں پاکستان سے کوئی محبت تھی اور نہ عوام سے دلچسپی، جب پاکستان سے نوکر شاہی کی 'محبت' کا ذکر چلا ہے، تو لگے ہاتھوں مشتاق احمد گورمانی کی "پاکستان محبت" کا ایک واقعہ سن لیجئے۔ اس واقعہ کے راوی گورمانی کے یار غار پینڈرل مون ہیں، جو انڈین سول سروس کے رکن تھے وہ اپنی کتاب (DIVIDE AND QUIT) میں لکھتے ہیں "ماہ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک دن نواب مشتاق احمد گورمانی (ان دنوں یہ ریاست بہاولپور کے وزیر اعظم تھے) پولیس کمشنر نور حسین اور میں چند سپاہیوں کے ساتھ ضلع بہاولپور کے دورے پر نکلے۔ بہاولپور نہر کے کنارے چلتے چلتے ابھی بیس میل ہی طے کئے ہوں گے کہ ہماری نظریں ایک ٹیلے پر پڑیں، وہاں دس، بارہ دیہاتی کھڑے "پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے ایک شخص جوان کا رہنما معلوم ہوتا تھا، درمیان میں پاکستانی جھنڈا لئے کھڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مسٹر گورمانی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ کار سے اتر کر انہوں نے پوچھا کہ "یہ کیا کر رہے ہو؟" ایک دیہاتی نے جواب دیا "سائیں پاکستان بن گیا ہے ہم جشن آزادی منا رہے ہیں۔" "ہوں! جشن آزادی کیا تمہیں اور کوئی کام نہیں جو پاکستان اور قائد اعظم کی رٹ لگا رہے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔" گورمانی کی ڈانٹ سن کر وہ بادل نخواستہ اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مسٹر مون کا کہنا ہے کہ تین چار آدمیوں نے جانے میں پس و پیش کی تو مسٹر گورمانی نے انہیں گرفتار کرا دیا اور قائم پور کے تھانے میں

غلام محمد، گورمانی اور چوہدری محمد علی ۱۶۔ اکتوبر کو راولپنڈی میں کیا کر رہے تھے ؟

پہلے وزیر اعظم کے قتل کے بعد سیاسی دنگل شروع ہو گیا

بند کروادیا۔ قائم پور کے تھانیدار نے مسٹر گورمانی کو بتایا کہ اس نے چند مسلمانوں کو "اندیشہ نقض امن" کے تحت گرفتار کیا ہے۔ گورمانی نے ان ملزموں کو لائن حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ ایک قطار میں کھڑے کر دیئے گئے تو پوچھ گچھ اور کسی ثبوت کے بغیر انہیں مجرم قرار دیتے ہوئے جوتے مارنے کا حکم دے دیا۔ گورمانی کا اشارہ پاتے ہی سپاہی بے گناہ قیدیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں حیوانوں کی طرح مارنا شروع کر دیا۔

یہی گورمانی، لیاقت علی کی شہادت کے چند گھنٹوں کے بعد وزیر داخلہ بنا دیئے گئے اور انہوں نے وزیر اعظم کے قتل کی تحقیقات میں رکاوٹیں ڈالیں۔ "ڈان" نے نکتہ چینی کی تو اس پر سرکاری اشتہارات کے دروازے بند کر دیئے گئے اور سرکاری دفتروں کو ہدایات دی گئیں کہ وہ "ڈان" نہ پڑھیں۔ اسمبلی میں بھی گورمانی پر الزام لگایا گیا کہ وہ جان بوجھ کر لیاقت علی کے قتل کی تحقیقات میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ میاں افتخار الدین نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

کہا انصاف نے میدان میں دست زلیخا سے
کہ دامن یوسف تو تیرا نام لیتا ہے

لیاقت علی کی شہادت کا معمہ ابھی تک حل طلب ہے۔ اگر مندرجہ ذیل سوالات کا جواب دیا جائے تو وزیر اعظم کے قتل کی سازش سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔

• لیاقت علی خان، راولپنڈی کے جلسے عام میں کیا اہم اعلان کرنے والے تھے؟

• سعد اکبر اور خان قیوم کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خان قیوم، لیاقت علی خان کے شدید مخالف تھے۔ آخری دنوں میں انہوں نے وزیر اعظم کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا تھا روزنامہ تیج دہلی کی اس خبر سے کس حد تک صداقت ہے،

• لیاقت علی خان مرحوم امریکہ سے تعلقات بڑھا رہے تھے اس لئے برطانوی حکومت نے خان عبدالقیوم خان کے ذریعے قاتل کی خدمات کرائے پر حاصل کیں، (روزنامہ تیج دہلی ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۱ء)

• پولیس، سعد اکبر کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتی تھی۔ پشاور پولیس نے پنڈی پولیس کو سعد اکبر کی روانگی کی اطلاع دے دی تھی۔ پنڈی پولیس نے اس کی نگرانی کیوں نہیں کی اور اسے اگلی قطاروں میں کیوں بیٹھنے دیا۔

• سعد اکبر کو زندہ گرفتار کرنے کی بجائے ہلاک کیوں کر دیا گیا؟ سب انسپکٹر محمد شاہ جس نے سعد اکبر کو ہلاک کیا، ملازمت سے ریٹائر کر دیا گیا۔ چند سال کے بعد اطلاع ملی کہ وہ عیش و آرام اور شاہانہ آن بان سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس اطلاع کے ملنے کے بعد وہ اچانک پاگل ہو گیا اور کچھ عرصے کے بعد مر گیا۔ سیکورٹی اسٹاف اور پولیس کے حکام، جو وزیر اعظم کی حفاظت کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہے، کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی گئی۔ انہیں ترقیاں کیوں دی گئیں؟

• جب کوئی شخص جرم کرتا ہے۔ جو وہ پنشن اور مراعات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن سعد اکبر کے ورثا کو پنشن کیوں دی جاتی رہی؟

لیاقت علی کے بعد برطانیہ نواز نوکر شاہی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ——!!

• لیاقت علی خان، برطانیہ سے ناراض تھے۔ اس کے باوجود اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں کو تحقیقات پر مامور کیا گیا۔ اور اس کی رپورٹ بھی شائع نہیں کی گئی۔ محمد علی بوگرہ کو الیف بی آئی کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟۔

• اسپیشل پولیس کے افسر اعزاز الدین، وزیر اعظم کے قتل کی سازش کی تحقیقات کر رہے تھے۔ لاہور سے روانگی کے وقت انہوں نے کہا تھا کہ مجھے لیاقت علی کے قتل کی سلسلے میں ایک اہم شہادت ملی ہے،، طیارے میں ان کے ساتھ پورا ریکارڈ تھا۔ یہ طیارہ راستے میں تباہ ہو گیا طیارے کی تباہی کے اسباب کیا تھے۔ ان پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔

• لیاقت علی کے قتل سے کچھ عرصہ قبل اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں تھیں کہ وہ اپنی کابینہ میں ردّ و بدل کرنے والے ہیں۔ اور غلام محمد اور گورمانی کو علیحدہ کر دیا جائے گا۔ لیکن وزیر اعظم کی شہادت کے بعد غلام محمد جو اس حد تک مفلوج اور معذور تھے کہ جب وہ پہلی بار گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوئے تو دو اے۔ ڈی۔ سی انہیں سہارا دیے رہے تھے۔ گورنر جنرل بن گئے اور گورمانی وزیر داخلہ بنا دیئے گئے

• پارلیمانی آداب کے مطابق وزیر اعظم کے انتقال یا قتل کے بعد کابینہ خود بخود برخاست ہو جاتی ہے۔ گورنر جنرل اسمبلی کا ہنگامی اجلاس بلواتا ہے اور اس میں نئی کابینہ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یا اکثریتی پارٹی اپنا لیڈر نامزد کر دیتی ہے۔ لیکن لیاقت علی کے قتل کے بعد گورنر جنرل نے اسمبلی کا ہنگامی اجلاس نہیں بلوایا اور نہ ہی مسلم لیگ کو جو اکثریتی پارٹی تھی۔ اپنا لیڈر نامزد کرنے کے لئے کہا گیا۔ بلکہ چوہدری محمد علی نے جو مرکزی چیف سیکرٹری تھے، وہ تمام کارروائیاں کیں، جو گورنر جنرل کرتا ہے۔ انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا جو فوراً ہی منظور کر لیا گیا۔ اور وہ مرکزی وزیر خزانہ بنا دیئے گئے۔ حالانکہ وہ اسمبلی کے رکن تھے اور نہ ہی مسلم لیگ کے ممبر۔ آخر یہ غیر جمہوری طریقہ کیوں اختیار کیا گیا۔

چور کی داڑھی میں تنکا

کیا 22 خاندانوں کے مجموعی اثاثے کی مالیت صرف 85 کروڑ روپے ہے؟

• ہمالیہ والا •

پاکستان نیشنل سینٹر کو دانشور تاجروں کی ضرورت

مثل مشہور ہے "چور کی داڑھی میں تنکا"۔ ہمارے بعض مفاد پرست تاجروں کی یہی حالت ہے۔ کہ وہ ہر بات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے خیال میں حکومت کے ہر اقدام کا مقصد انکی چھپی ہوئی دولت کا پتہ لگانا ہے۔ چاہے حکومت کے کسی اقدام کا مقصد تاجروں کے درمیان گمنام "دانشوروں" کا پتہ لگانا ہی کیوں نہ ہو۔

گذشتہ دنوں حکومت پاکستان کے صدارتی امور کے ڈویژن نے تجارتی تنظیموں سمیت ملک کے مختلف سماجی اور دیگر اداروں سے ان کے ارکان دانشوروں کی زندگی کے حالات کی تفصیلات طلب کیں تاکہ حکومت کی روز بروز کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے لئے ان دانشوروں سے رابطہ قائم کرکے ان کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔

حکومت کے ہدایت نامہ کے جواب میں پاکستان میں تاجروں کی سب سے بڑی تنظیم ایوانِ تجارت و صنعت کراچی نے اپنے ارکان کو ایک گشتی مراسلہ ارسال کیا ہے۔ جس میں ہر رکن سے BIO - DATA طلب کیا گیا ہے۔ ایوان کی ذیلی کمیٹی اپنے ارکان سے حاصل شدہ تفصیلات میں سے چند تاجروں (جو اس کمیٹی کی نظر میں دانشوروں کے زمرے میں آتے ہیں) کے حالاتِ زندگی حکومت پاکستان کے صدارتی امور کے ڈویژن کو بھیجنے کی سفارش کرے گی۔ جب کہ باقی ارکان کے متعلق تفصیلات ایوان کے ریکارڈ میں رہیں گی۔

ایوانِ تجارت وصنعت کراچی کے اس گشتی مراسلہ پر مقامی تاجروں کے حلقوں میں طرح طرح کی چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ بعض تاجروں کا خیال ہے کہ حکومت ان حقائق کی روشنی میں ان کی چھپی ہوئی دولت کا پتہ چلائے گی۔ لہذا گذشتہ چند سالوں میں انہوں نے اقتصادی "فرنٹ" پر جو "کارنامے" انجام دیئے ہیں اور جو منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادیں بنائی ہیں ان کے تحفظ کیخاطر ایوان کو صحیح معلومات مہیا نہیں کرنی چاہئیں۔

جبکہ پڑھے لکھے نوجوان تاجروں کا خیال ہے کہ وزیر اطلاعات و نشریات مولانا کوثر نیازی کے قائم کردہ پاکستان نیشنل سنٹر کے مختلف علاقائی دفاتر میں آئے دن مذاکرے منعقد کرنے کے لئے وزارت اطلاعات کو "دانشوروں" کی ایک بہت بڑی کھیپ درکار ہے۔ لہذا دانشوروں کے موجودہ "کال" کو ختم کرنے کے لئے ملک کے ٹیلنٹڈ کلاس طبقے کے تاجروں میں سے بھی جواہر تلاش کئے جا سکیں۔

چند پرانے کہنہ مشق تاجروں (جنہوں نے گذشتہ بیس سال میں مشرقی و مغربی پاکستان کے عوام کو دو دو ہاتھوں سے لوٹا ہے) کا خیال ہے کہ جائیدادوں، اور اثاثوں کے متعلق انہوں نے جو گوشوارے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں جمع کرائے تھے۔ حکومت ان معلومات سے مطمئن نہیں ہے۔ لہذا ملک کے خوشحال AFFLUENT طبقے کی اصل مالیت کا پتہ چلانے کے لئے دوسرے طریقۂ کار اختیار کئے جا رہے ہیں۔

ان مفاد پرست تاجروں کا خدشہ صحیح ہے کیونکہ ان گوشواروں کے تحت (جس کی تفصیل اس سال کے شروع میں حکومت نے تمام اخبارات میں شائع کرائی تھی) پاکستان کے ۲۲ امیر ترین گھرانوں کے مجموعی اثاثے صرف ۸۵ کروڑ روپے کی مالیت کے ہیں جو بھارت کے امیر ترین خاندان ٹاٹا کے مجموعی اثاثوں (ساڑھے آٹھ

ارب روپے) کا صرف دس فیصد اور بھارت کے دسویں نمبر پر امیر خاندان والچند کے ایک ارب ۳۵ کروڑ روپے کے اثاثوں کے ۵ ۶ فیصد سے بھی کم ہیں۔

حکومت کے زیرِ انتظام سرکاری خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے ذریعے سے جاری کئے گئے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے امیر ترین خاندان سہگل کے مجموعی اثاثے ۱۵ کروڑ روپے سے بھی کم مالیت کے ہیں۔ جبکہ بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی صنعتکار احمد داؤد کے خاندان کے مجموعی اثاثے صرف سات کروڑ روپے کے لگ بھگ ہیں۔

ان حقائق کے پسِ منظر میں چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق مفاد پرست تاجروں کو صدارتی امور کے ڈویژن کے ہدایت نامے پر تشویش ضرور ہونی چاہیئے۔

انہی اعداد و شمار کے مطابق سابق صدر ایوب کے سب سے بڑے صاحبزادے گوہر ایوب خان کے اثاثے ڈیڑھ کروڑ روپے سے بھی کم مالیت کے ہیں۔

سہگل کے شیش محل اور دوسرے سرمایہ داروں کے خفیہ اثاثوں کا قصہ ایک طرف سابق صدر ایوب سے کاروباری دوستی گانٹھنے سے بہت پہلے "داؤد برادران" نے اپنے انکم ٹیکس و دیگر محصولات بچانے کے لئے ۱۹۶۱ء میں ڈھائی کروڑ روپے کی مالیت کے فاضل سرمایہ سے ایک فلاحی ٹرسٹ "داؤد فاؤنڈیشن" قائم کیا تھا لیکن ایوب خاندان سے ساجھے کے بعد داؤد برادران نے صنعتی ترقیاتی کارپوریشن سے کرنافلی پیپر ملز ہتھیا لیا پھر صدیق داؤد قومی اسمبلی کے رکن بنے اور داؤد ہرکولیس جیسے کروڑوں ڈالر کے منصوبے قائم کئے گئے لیکن اس کے باوجود داؤد خاندان کے اثاثوں میں ایک ٹیڈی پیسہ کا اضافہ نہیں ہوا۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے گویا بارہ سال تک مسٹر احمد داؤد، مسٹر صدیق داؤد اور ان کے خاندان کے درجنوں "ذہین" افراد پاکستان کے کروڑوں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اور قوم کے عظیم تر مفاد کی خاطر سرگرم رہے!!

جی ہاں چور کی داڑھی میں تنکا!!!



آج وہ بہت خوش تھا۔ آج نجانے کیوں اُسکا دل کہہ رہا تھا کہ اسے ضرور ملازمت مل جائے گی۔ صبح صبح ٹھنڈے یخ پانی سے نہاتے ہوئے بڑا لطف آرہا تھا۔ نہانے کے دوران وہ اپنی پسندیدہ دھن گنگنانے لگا۔ آج کے انٹرویو میں اسے پوری امید تھی کہ وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ حالانکہ گذشتہ تین سال سے انٹرویو دیتے دیتے تنگ آچکا تھا۔ اس کے باوجود آج کے انٹرویو میں اسے کامیابی کی قوی امید تھی۔

نہاکر جب نکلا تو اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

" آج بہت خوش نظر آرہے ہو کیا بات ہے بیٹا۔"

" ہاں ماں آج میں بہت خوش ہوں آج مجھے ملازمت ضرور مل جائے گی پھر ہمارے سارے دکھ دور ہوجائیں گے۔ اب گڈو بھی اسکول جائے گا۔ آپا کی دوائیں بھی آجائیں گی۔ اور یہ جو تم دن رات سلائی کرکے آنکھیں خراب کرتی ہو تم کو اب سلائی بھی نہیں کرنے دوں گا۔ اور ہاں وہ جو تم کہا کرتی ہو کہ جلدی سے ملازم ہوجا، تو تیرے لئے چاند سی دلہن لادوں گی۔ اب تمہاری ساری خواہشیں پوری ہوجائیں گی۔"

وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا لیکن ماں کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ وہ ماں کے اداس چہرے کو دیکھ کر لمحے بھر کے لئے پژمردہ ہوگیا۔ کیا بات ہے ماں تم خوش نہیں ہوگی۔

" نہیں میرے لال میں بہت خوش ہوں گی لیکن اتنے سالوں سے ہر روز آس بنتی ہے پھر ٹوٹ جاتی ہے کہیں آج بھی ایسا نہ ہو۔"

" نہیں ماں آج مجھے پوری امید ہے۔ آج میں ضرور کامیاب لوٹوں گا۔" ماں کو تسلی دیتے وقت اس کے دل میں خیال آیا اتنی طویل ناکامیوں کے بعد خدانخواستہ آج بھی ناکامی ہوئی تو میں ماں کو کیا جواب دوں گا۔ اس کے دل میں لمحہ بھر کے لئے مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن پھر اک آس بندھی شاید آج مجھے نوکری مل جائے۔

ناشتہ سے فارغ ہوکر اس نے الوداعی نگاہ آئینہ کی طرف ڈالی تو اسے اپنا چہرہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آیا۔ آج سے چند سال پیشتر یہی چہرہ کتنا خوبصورت اور تندرست تھا لیکن آج غموں نے چہرے کی ساری جاذبیت چھین لی تھی اسے بڑا ملال ہوا اپنی اکلوتی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ننھے مسعود سے پوچھا، کیوں آج میں کیسا لگ رہا ہوں۔ ننھے مسعود نے بھولپن سے جواب دیا اچھے لگ رہے ہیں لیکن، آپ اس وقت اور اچھے لگیں گے جب ہمارے لئے اچھے اچھے کپڑے لائیں گے۔ پچھلی عید پر بھی آپ نے کہا تھا کہ کپڑے لاؤں گا لیکن نہیں لائے۔ اس عید پر میں بہت اچھے کپڑے بنواؤں گا اور بہت ساری عیدی لوں گا۔ بھائیجان آپ تو کہتے ہیں جب نوکری مل جائے گی تو ہمارے دکھ دور ہوجائیں گے، لیکن یہ نوکری کیوں نہیں ملتی۔"

ننھے بھائی کی شکایتیں اسے بڑی جائز لگیں اسکے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ میں بھی کتنا بدنصیب ہوں، میں کسی کے لئے کچھ نہ کرسکا۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو میں سارے جہان کی خوشیاں ان کے قدموں پر ڈال دیتا لیکن ننھے تو نہیں جانتا کہ تیرا بھائی کتنا مجبور ہے۔ آج میں ضرور نوکری حاصل کروں گا۔ مجھ سے یہ حالت نہیں دیکھی جاتی یا خدایا یہ کیسا انصاف ہے۔ کیا ہمیں اس دنیا میں جینے کا حق نہیں ہے۔ انہی خیالوں میں غلطاں وہ بس اسٹاپ کی جانب چل پڑا۔ ابھی سات بجے تھے اور اسے ٹھیک آٹھ

بجے انٹرویو کے لئے پہنچنا تھا۔

بس اسٹاپ پر لوگوں کا ہجوم تھا، کہیں دفتر جانے والوں کا جھمگٹ، کہیں رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس اسکول اور کالج کی لڑکیاں نظر آئیں اور کچھ منچلے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر لڑکیوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ اسٹاپ کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

اسے سامنے سے ایک نوجوان جوڑا آتا ہوا نظر آیا دونوں کے چہروں سے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی دھن میں مگن سارے جہاں کو بھلا بیٹھے ہوں۔ شاید نئی نئی شادی ہوئی ہوگی۔ انہیں دیکھ کر نرگس کی معصوم صورت اسکی نگاہوں میں گھوم گئی۔ خیالوں میں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نرگس کی بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہا ہو۔ نرگس جو اس کے دل کی دھڑکن ہے۔ جس کے لئے نجانے کتنے سہانے خواب دیکھ ڈالے جو اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی جسکی معصوم مسکراہٹ پر وہ اپنی جان بھی نچھاور کر سکتا ہے۔ جس کی خاطر وہ دنیا کی تمام طاقتوں سے ٹکرا سکتا ہے اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ کسی بات پہ وہ روٹھ گئی تھی تو جب تک صلح نہیں ہو گئی اسے نیند نہیں آئی۔

تصوّر میں وہ سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن کے روپ میں نظر آئی۔ ماں کی دیرینہ خواہش کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے چاند سی بہو لائے گی۔ شائد دنیا کی ہر ماں اپنے بیٹوں کے لئے چاند سی بہو لانے کی خواہش رکھتی ہوں گی لیکن میری ماں کتنی بد نصیب ہے جس کا بیٹا ابھی تک اس قابل نہ ہو سکا کہ اپنی خواہش پوری کر سکے۔ آج نوکری مل گئی تو وہ اپنی نرگس کو ڈولی بٹھا کر اپنے گھر لے آئے گا جہاں وہ ہوگا اور اس کی اپنی نرگس، ایک ایسی دنیا آباد ہوگی، جہاں دور دور تک غموں کا پتہ نہ ہوگا۔ بس کی آمد نے خیالوں کا لامتناہی سلسلہ توڑ دیا۔

جب کمپنی کی عمارت میں داخل ہوا تو بہت سارے اپنے جیسے امیدوار نظر آئے۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اتنی چھوٹی ملازمت کے لئے اتنے سارے امیدوار، شاید ہمارے ملک میں تعلیمیافتہ لوگوں کی شرح بڑھ گئی ہے۔ سب کے چہرے اسے اپنے جیسے ہی دکھی لگے، ہر اس آس میں ہوگا کہ وہی کامیاب ہوگا، چلو قسمت آزمائی جائے۔

انٹرویو لینے والوں کے نام پکارے جانے لگے۔ اپنی باری پر جب وہ جنرل مینیجر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا، ہو سکتا ہے میری تعلیم اور قابلیت دوسروں سے بہتر ہو اور میں منتخب ہو جاؤں۔

سب سے پہلا سوال تعلیم کے بارے میں تھا۔ اسنے بڑے فخر سے بتایا کہ وہ ایم اے ہے۔ وہ دوسرے سوال کا منتظر ہی تھا کہ اس کے کانوں میں مینیجر کی آواز آئی مجھے افسوس ہے کہ آپ کی تعلیم زیادہ ہے۔ ہمیں کلرک کی آسامی کے لئے صرف میٹرک تک تعلیم چاہیئے۔ اس کی تمام خوشی کافور ہو گئی۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ بوجھل قدموں سے وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے ذہن میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔ وہ بڑا کرب محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ گھر جا کر کیا جواب دے گا۔ باہر نکلنے کے بعد اس کے حواس ٹھیک نہیں ہوئے۔ وہ خالی الذہن بائیں جانب جانے والی ویران شاہراہ پر ہو لیا۔ اسے اپنے گرد و پیش کی خبر نہ تھی۔ وہ کہاں جا رہا ہے کیوں جا رہا ہے اسے ہوش ہی نہ تھا۔ آخر کب تک صرف امیدوں کے سہارے زندہ رہا جا سکتا ہے۔ اسے یہ دُکھ مارے ڈال رہا تھا کہ آج ماں کو کیا جواب دے گا۔

وہ شہر کی سڑکوں پر بے مقصد چلتا رہا۔ اس کے سامنے کوئی منزل نہ تھی، نہ گھر جانے کا خیال تھا۔ نہ سردی کا احساس۔ وہ صرف ایک بات سوچ رہا تھا کہ وہ ایک نکمّا اور بے کار آدمی ہے جس کی ذات سے کسی دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا وجود ایک بوجھ ہے۔ جو آج تک دوسروں کا کیا اپنے معذور باپ کا علاج نہ کرا سکا۔ جو اپنے ننھے بھائی کے لئے عید کے کپڑے نہ بنا سکا جو اپنی جوان بہن کی ڈولی نہ وداع کر سکا۔

شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ سردی میں اضافہ ہو چلا تھا۔ لیکن وہ اپنے ماحول سے بے خبر چلتا رہا۔ اچانک اسے گھر جانے کا خیال آیا لیکن اسے ماں یاد آئی جو اس آس میں بیٹھی ہوگی کہ اس کا بیٹا آج ضرور کامیاب لوٹے گا۔ وہ قرض دار یاد آئے جن کا نجانے کتنے عرصے کا قرض چلا آ رہا ہے۔ محلے کا دکاندار، دودھ والا، لکڑی والا اور نجانے کتنے لوگ۔ قرض خواہ کب تک ٹلتے رہیں گے۔ اب تو کوئی اثاثہ بھی نہیں ہے۔ گھر کی ہر شے بک چکی ہے۔ ماں اور بہن کے سارے زیور، گھڑیاں، پرانی یادگار چیزیں۔ آج میں کیسے گھر جاؤں، میرا بیمار باپ، اس امید پر منتظر ہوگا کہ اس کا بیٹا آج اس کے لئے ضرور دوا لائے گا۔ ننھا مسعود منتظر ہوگا کہ بھائیجان آج ضرور اچھے اچھے کپڑے لائیں گے۔ اب میری بہن کے ہاتھوں میں کبھی مہندی نہیں رچے گی۔ اب میری ماں کبھی نرگس کو بہو نہ بنا سکے گی۔ کیونکہ اس کا بیٹا ایک نکمّا اور فضول آدمی ہے جو چاندی کے چند سکے نہیں کما سکتا۔ جس سے اس دنیا میں خوشیاں خریدی جاتی ہیں جس کی خاطر لوگ ایک دوسرے کی جان لے لیتے ہیں۔ جس کے لئے لوگ اپنی عصمتیں عزتیں بیچ ڈالتے ہیں۔

وہ خیالوں میں گم چلتا رہا، دور سے ساحل کی روشنیاں نظر آئیں۔ رات ہو چکی تھی، سردی اپنے شباب پر تھی ساحل کے قریب اسے کچھ عورتیں، مرد، بچے قہقہے لگاتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا میں صرف وہی دکھی ہے اور بقیہ سارے لوگوں کو کوئی دکھ نہیں ہے۔

وہ ان خوش و خرم چہروں کے درمیان سے ہوتا ہوا ساحل کی جانب تیز تیز قدم بڑھاتا گیا۔ وہ جلد از جلد ان رنگ برنگے چہروں اور کھوکھلے قہقہوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ لوگ واپس شہر کی جانب جا رہے تھے۔ ساحل ویران ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ساحل کے قریب ٹھنڈی ریت پہ بیٹھ کر اسے لمحے بھر کے لئے بڑا سکون محسوس ہوا۔ لہروں کی آوازیں موسیقیت محسوس ہوئی، جیسے کوئی بہت ہی مدھم لے پر کوئی دکھ بھرا نغمہ گا رہا ہو۔ وہ دُور خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ چاروں جانب ایک مہیب خاموشی تھی۔ اس کا ذہن ماضی کی حسین یادوں میں الجھ گیا۔ جب وہ کالج میں پڑھ رہا تھا اور نرگس سے جب اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا

چاہتا ہوں تو اس کی آنکھوں میں کتنی حسین چمک پیدا ہوتی تھی جو زندگی بھر نہیں بھول سکے گا۔ اسے یاد آیا جب والد صاحب پر فالج کا حملہ نہیں ہوا تھا کتنی پرسکون زندگی تھی۔ اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ صرف کالج جاؤ، کھیلو کودو محبت کرو، سو جاؤ کتنے خوبصورت دن تھے۔

اسے یاد آیا کہ ماں نے کہا تھا کہ میرا بیٹا اپنے باپ سے بھی بڑا افسر بنے گا۔ لیکن میں بڑا افسر تو کیا بنتا ایک کلرک بھی نہ بن سکا۔ چند سالوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ تصور میں اپنے تمام عزیز چہروں کو یاد کرتا رہا۔ ماں، باپ، بھائی بہن اور اس کی اپنی نرگس۔ جو کب سے اس آس میں بیٹھی ہے کہ کب اس کے خوابوں کا شہزادہ ڈولی پہ بٹھا کے لے جائے گا۔ لیکن اب وہ کبھی بھی اس کی نہ ہو سکے گی۔ یہ باتیں سوچ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں اس کا دل چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رو دے۔

وہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر یہ بتلائے کہ اے دنیا والو! مجھے تمہاری دنیا سے نفرت ہے۔ جہاں انصاف نہیں ہے۔ جہاں جھوٹ مکاری، دغابازی عیاری کا راج ہے۔ جہاں غریبوں کے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جہاں صرف دولت کی پوجا ہوتی ہے۔ مجھے ایسی دنیا نہیں چاہئے۔ یہ دنیا تو صرف دولتمندوں کیلئے ہے۔ جھوٹوں کے لئے دغابازوں کے لئے ہے۔ مجھے اس سماج سے نفرت ہے۔ جہاں چاندی کے، چند کھنکتے ہوئے سکوں کے عوض بہنوں کی عصمتوں سے کھیلا جاتا ہے۔

اسے اپنے دوست کے کہے ہوئے د، جملے ذہن میں گونجے کہ یہ دکھ یہ مسائل صرف تمہارے ساتھ ہی نہیں نہ جانے تم جیسے کتنے لوگ ہیں جن کے باپ معذور ہو چکے ہیں۔ نجانے کتنی بہنیں ہوں گی جن کے چہروں پہ کبھی سہرے نہیں سج سکتے۔ نہ جانے کتنی مائیں ہوں گی جن کی خواہش ہو گی کہ ان کا بیٹا بڑا افسر بن کر ان کے دکھ دور کرے گا۔ نہ جانے کتنی دوشیزائیں ہوں گی جنکے محبوب اس وجہ سے نہ اپنا سکے ہوں گے کہ انکے پاس دولت نہ ہو گی۔ یہ دکھ صرف تمہارے ہی نہیں۔ بلکہ مادرِ وطن کے گوشے گوشے میں دکھوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ جہاں بھوک ہے عزبت ہے افلاس ہے جہالت ہے۔ اور کروڑوں لوگ ان مصائب کا شکار ہیں۔ بزدل نہ بنو، حالات سے لڑتے رہو۔ یہ باتیں سن کر اسے ڈھارس ہوتی تھی لیکن آج صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اب وہ کل کی آس پہ زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا

رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی۔ لہروں کا شور سناٹے میں بھیانک لگ رہا تھا، وہ سمندر کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کا ہر قدم اپنے پیچھے نشان چھوڑ رہا تھا جیسے کوئی انجانا راہی منزل سے بھٹکنے کے ڈر سے اپنی نشانی چھوڑ رہا ہو۔ پانی لحظہ بہ لحظہ قریب آ رہا تھا۔ ایک بڑی لہر نے اس کے وجود کو چھپا لیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو کچھ لوگ اس پر جھکے ہوئے تھے۔ شاید کسی ہسپتال میں پڑا تھا۔ لیکن وہ تو مر چکا ہے اس نے اپنے جسم میں چٹکی لی کہ آیا وہ واقعی زندہ ہے، یا مر چکا ہے۔ ابھی پوری طرح ہوش میں بھی نہ آیا تھا۔ کہ سامنے سے پولیس انسپکٹر چند کانسٹیبلوں کے ہمراہ نظر آیا اسے اقدام خودکشی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا کہ اس معاشرہ نے اسے زندہ رہنے کا حق نہیں دیا، اس سے مرنے کا حق بھی چھین لیا ہے۔

جب وہ ہتھکڑی پہنے ہسپتال سے رخصت ہوا تو ہسپتال کے لوگوں کو دور کسی کے قہقہوں کی آواز سنائی دی وہ بے تحاشا قہقہے لگا رہا تھا، شاید وہ اپنی بے بسی پر ہنس رہا تھا یا اس سماج کے انصاف پر۔

بقیہ • داؤد سبحانی

لوگ سوال کریں گے تو ہم انہیں کیا جواب دیں گے۔ یہی کہ ہم اسے ایک ایسی جگہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے جہاں اس کی جان کا زبردست خطرہ تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور کس طرح اعجاز الرحمان کو اس خطرے سے نکال کر لاؤں۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے دوسرے ساتھیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ پہلے ہم کنٹونمنٹ چلیں، پھر وہاں پر پروگرام بنائیں گے کہ کس طرح اعجاز الرحمٰن کو ان کے نرغے سے چھڑایا جا سکتا ہے۔"

اسی گو مگو کی حالت میں ہم کنٹونمنٹ پہنچ گئے یقین کیجئے کہ میرے حواس بجا نہ تھے۔ پہلی بار اعتماد اور یقین کا جذبہ چھنتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر اعجاز الرحمٰن کا خیال آتا تھا۔ کنٹونمنٹ کے کچھ لوگوں نے جنہیں حالات کا کچھ علم نہ تھا۔ مجھ سے میری پریشانی کا سبب معلوم کیا۔ مگر میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا۔

ابھی ہم لوگ اس سنگین مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں کچھ پروگرام طے بھی کرنے نہ پائے تھے کہ ایک عجیب مگر انتہائی دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ دیکھا تو سامنے سے اعجاز الرحمان اپنے ہاتھوں میں سگریٹ کے متعدد پیکٹ اور کیک لئے، سیٹی بجاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، میں نے اپنے جسم میں چٹکی بھر لی، نہیں یہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت تھی۔ میں نے مجنونانہ انداز میں دوڑ کر اعجاز الرحمٰن کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اعجاز الرحمان کی واپسی کا بڑا عجیب لطیفہ ہوا۔ ہوا یہ کہ جب ہم اس جگہ سے بھاگ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے اعجاز الرحمان کو پکڑ لیا۔ کسی نے کہا کہ یہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ لیکن اعجاز الرحمان نے انکار کر دیا۔ اس کی جیب میں ایک روسی اخبار کے نمائندہ کا وزیٹنگ کارڈ پڑا ہوا تھا اس نے کارڈ نکال کر انہیں دکھایا اور بتایا کہ وہ مغربی پاکستانی نہیں ہے، بلکہ روس کے اخبار کا نمائندہ ہے۔ چونکہ اس کا رنگ گورا تھا اور چہرے مہرے سے وہ کسی حد تک روسی یا یورپی نظر آ رہا تھا۔ اس لئے لوگوں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ اس طرح اعجاز الرحمٰن روسی بن کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

داؤد سبحانی نے بتایا کہ ڈھاکہ کنٹونمنٹ سے مغربی پاکستانیوں کو ۱۷ جنوری کو بذریعہ ٹرین نارائن گنج، اور پھر اس کے بعد موٹر لانچ میں بٹھا کر کھلنا پہنچایا گیا۔





شاہ بھومی بھوم

عالمی سیاست

الفتح رپورٹ

فوج نے طلبہ پر گولی چلانے سے انکار کردیا

تھائی لینڈ سے فوجی آمر کا فرار، طلبائی شاندار فتح

۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو امریکی سامراج کے فوجی اتحادی اور سیٹو کے سرگرم رکن ملک، تھائی لینڈ سے سامراج نواز وزیراعظم اور فوجی آمر فیلڈ مارشل تھانم کٹیکا چورن اور وزیر دفاع جنرل پرفس کردتھین کا ملک سے فرار اور بنکاک یونیورسٹی کے جمہوریت پسند ڈاکٹر سانیا کی بطور وزیراعظم تقرری، تھائی لینڈ کے طلبا کی حرارت، قوت اور فتح کا مظہر ہے۔ اور اس بات کی علامت ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں سامراج کی زندگی اور مختصر ہو گئی ہے۔

یکم اکتوبر کو تھائی لینڈ کے طلبہ نے فوجی آمر تھانم اور اس کی حکومت کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا، وہ سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کے ہاتھوں میں پلے کارڈ تھے اور وہ نعرے لگا رہے تھے "فوجی حکومت مردہ باد، جمہوریت بحال کرو، سامراجی معاہدے توڑ دو، ایشیا ایشیائیوں کے لئے ہے۔ امریکیو! تھائی لینڈ سے نکل جاؤ۔" وقت گذرتا گیا، نعروں کی گھن گرج بڑھتی گئی۔ سامراج نواز وزیراعظم تھانم نے پولیس اور فوج کو کارروائی کا حکم دیا۔ کہا گیا کہ "یہ کمیونسٹوں کی شرارت ہے، وہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ انہیں کچل دو" چنانچہ فوجی دستوں اور مسلح پولیس نے مزاحمت کی، اور پھر وہی ہوا جو ایسے



ڈاکٹر سانیا کو عوام اور طلبہ کی حمایت حاصل ہے

موقعوں پر ہوتا ہے۔ آنسو گیس پھینکی گئی۔ فائرنگ ہوئی اور مظاہرہ کرنے والے طلبا زخموں سے نڈھال ہو ہو کر گرنے لگے۔ بنکاک یونیورسٹی میں فوجی دستے داخل ہو گئے۔ فوجی اور بھاری بھرکم جوتوں نے اس مقدس درسگاہ کا مذاق اڑایا۔ یونیورسٹی کے در و بام خون کے چھینٹوں سے لالہ زار ہو گئے۔

اگلے دن طلبہ نے پھر مظاہرہ کیا، اور حکومت نے وہی خونی ڈرامہ رچایا، سڑکوں پر لہو بہنے لگا۔ تو عوام، جو پہلے ہی تھانم حکومت کی جمہوریت کش اور سامراجی پالیسیوں سے نالاں تھے، طلبہ کے ہمنوا بن گئے۔ جس سے طلبا تحریک کو تقویت ملی۔ پھر روزانہ مظاہرے ہونے لگے تھانم اور اس کے حواری جنرلوں نے اپنا اقتدار بچانے کے لئے پوری فوجی طاقت جھونک دی، ٹینک اور فوج تک استعمال کی گئی۔ ریاستی طاقت نے سڑکوں کی طاقت کو کچلنے اور دبانے کے لئے ہر حربہ اور ہر طریقہ اختیار کیا، لیکن ہر سزا کے بعد سڑکوں کی طاقت کا "ذوقِ جرم" بڑھتا گیا۔ ۱۲۵ مظاہرین نے اپنے لہو سے مادرِ وطن کو رنگ دیا۔ مسلح فوج نے ایسی عمارتوں کو مسمار کر دیا۔ جن میں طلبہ اور مظاہرین نے پناہ لے رکھی تھی۔ تمامتر تشدد آمیز کارروائیوں کے باوجود طلبہ کی تحریک جاری رہی۔

بالآخر ۱۴ اکتوبر کو تھائی لینڈ کا فوجی آمر اپنے دستِ راست وزیر دفاع جنرل کردتھین کے ہمراہ ملک سے فرار ہو گیا اور شاہ بھومی بھول نے بنکاک یونیورسٹی کے ڈاکٹر سانیا کو وزیراعظم مقرر کر دیا۔

تھائی لینڈ کے طلبہ کو اتنی جلدی کامیابی کی اُمید نہیں تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ۱۴ دن کی تحریک فوجی حکومت کا تختہ الٹ دے گی۔ طلبہ تحریک کی اس کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ تھائی فوج اور پولیس نے طلبہ پر فائرنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے دلوں میں بھی طلبہ کے لئے ہمدردیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ تھانم کے فرار کے بعد فوج کے کمانڈر جنرل کرس سار وانے اعتراف کیا کہ اس نے حکومت کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا "میں طلبہ کو

سارجنٹ کے

بچوں کی آیا بھی
طلبہ کی حمایت میں
سڑکوں پر نکل آئی

ہلاک نہیں کروں گا۔ میرا دل مزید تھائی نوجوانوں کو مارنے پر آمادہ نہیں ہوتا"۔ بنکاک کی ایک چوکی کے ایک پولیس سارجنٹ نے بتایا کہ "ہمیں بتایا گیا تھا کہ کمیونسٹ دارالحکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں لیکن جب میں نے کمیونسٹوں کی بجائے بچوں کو دیکھا اور میں نے سنا کہ میری آیا ان بچوں کی حمایت کے لئے دیہات سے شہر میں آگئی ہے۔ تو میں نے فائرنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ہم نے یہ چوکی خالی کر دی۔

تھائی لینڈ کا محل وقوع

تھائی لینڈ کا کل رقبہ ۲۰۰۱۸۴ مربع میل ہے۔ اسکی سرحدیں شمال میں برما اور لاؤس سے، مشرق میں لاؤس اور کمبوڈیا سے ملتی ہیں۔ مغرب خلیج سیام اور برما کا علاقہ ہے اور زیریں علاقہ جزیرہ نمائے ملایا سے جا ملتا ہے۔ تھائی لینڈ معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ سونے، چاندی، ٹن، تانبے، لوہے، یاقوت اور کوئلے کے ذخائر پائے جاتے ہیں۔ زرعی پیداوار میں چاول سرفہرست ہے۔ جو برآمد بھی کیا جاتا ہے۔

امریکی سامراج کا تسلط

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب فرانس نے جنوب مشرقی ایشیا سے پسپائی اختیار کی۔ تو امریکی سامراج نے اس کی جگہ لے لی، تھائی لینڈ کے عوام اپنے قریبی پڑوسی ویت نام سے متاثر تھے وہ سامراجی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکنا چاہتے تھے۔ لیکن برسرِ اقتدار طبقے نے اپنے مفادات کے لئے تھائی لینڈ کو سیٹو کی زنجیروں سے جکڑ کر اسے امریکی سامراج کی گود میں ڈال دیا۔ ویت نام کمبوڈیا، اور لاؤس میں قومی جنگ آزادی شروع ہوئی تو امریکی سامراج نے تھائی لینڈ کو امریکی فوجی اڈے میں تبدیل کر دیا، تھائی عوام کو "رضاکار" بنا کر لاؤس کی جنگ میں جھونکنے لگا۔ ویت نام، کمبوڈیا اور لاؤس میں لڑنے والے امریکی فوجی اپنی تفریحی چھٹیاں گزارنے کے لئے تھائی لینڈ آتے اور اس طرح تھائی لینڈ امریکی فوجیوں کے لئے عیاشی کا اڈہ بن گیا۔ جس سے عوام میں اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ حکمران طبقے نے پروپیگنڈہ کیا۔ کمبوڈیا ہمارا پرانا دشمن ہے۔ اس لئے تھائی عوام کو "رضاکار دستوں" میں بھاری تعداد میں شمولیت اختیار کر کے اپنے پرانے دشمن سے بدلہ لینا چاہیئے۔ لیکن تھائی عوام خصوصاً طلبہ کا موقف یہ تھا کہ "اب لاؤس، کمبوڈیا اور تھائی لینڈ سامراجیوں کے غلام بن گئے ہیں۔ اس لئے آپس کی جنگ بے معنی ہے قومی جنگِ آزادی کے لئے تینوں ملکوں کے عوام کو آپس میں تعاون کرنا چاہیئے"، چنانچہ انہوں نے لاؤس میں "تھائی رضاکار" بھیجنے کی مخالفت کی، امریکی امداد اور امریکہ کے فوجی معاہدوں اور فوجی اڈوں کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔



ہر جمہوری
مطالبہ کو
کمیونسٹوں کی
شرارت قرار
دیا جاتا ہے

تھائی لینڈ میں مارشل لاء کا نفاذ

فوجی حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے عوام نے عام انتخابات کا مطالبہ کیا، فروری ۱۹۶۹ء میں انتخابات ہوئے۔ یہ انتخابات جمہوری دستوریہ کی بنیاد پر ہوئے اور اس میں حزبِ اختلاف کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی لیکن فوج جو کسی نہ کسی طرح گذشتہ دس سال سے حکومت کر رہی تھی۔ اقتدار سے دست بردار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ابھی دستور کو نافذ ہوئے بمشکل دو سال ہی ہوئے تھے کہ فوج نے دوبارہ اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔

ڈاکٹر سانیا

۱۴ اکتوبر کو شاہ بھومی بھوم نے بنکاک یونیورسٹی کے ڈاکٹر سانیا کو نیا وزیر اعظم نامزد کیا ہے۔ ڈاکٹر سانیا عوام اور طلبہ میں یکساں مقبول ہیں۔ ڈاکٹر سانیا جمہوریت کے حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست میں فوج کے اثر و نفوذ کے باوجود انہوں نے صرف ایک فوجی کو اپنی کابینہ میں شامل کیا ہے۔ نیوز ویک کے حالیہ شمارہ کے مطابق فوج کے بعض حلقوں میں سابق وزیر اعظم فیلڈ مارشل تھانم کا اثر و رسوخ ابھی تک باقی ہے۔ اسلئے ردِ انقلاب کا بھی امکان پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر ڈاکٹر سانیا نے ملک کو جمہوری دستور دے دیا اور دستوری اصلاحات کو نافذ کر دیا۔ تو فوجی انقلاب کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

خیبر سے کیماڑی تک

رحمان بابا کی زمین محنت کشوں کے لئے تنگ ہو گئی



تحریر ۔ افضل جنجوعہ

پختون زلمے سرحد کے جاگیرداروں کی پرائیویٹ فوج ہے

صوبہ سرحد میں مزارعین پر خوانین کے مظالم انتہائی سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں۔ یحییٰ خان کے زمانہ میں ۲۱ جولائی ۱۹۷۱ء سے منڈی کے کھیتوں میں شروع ہونے والے کسانوں کے قتل عام کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا۔ خوشحال خان اور رحمان بابا کی سرزمین میں محنت کشوں کے لئے جینا محال ہے زمینوں سے کسانوں کی غیر قانونی اور جبری بے دخلی، پکڑ دھکڑ لوٹ مار، آتش زنی، مارپیٹ اور قتل وغارت کے واقعات بدستور جاری ہیں۔ مٹھی بھر جاگیردار خانوں، ان کے پالتو غنڈوں اور حالی موالیوں نے لاکھوں محنت کشوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے یکے بعد دیگرے مرکزی اور صوبائی حکومتیں بدلتی رہی ہیں لیکن کسی حکومت نے بھی سرحد کے لاکھوں پریشان حال کسانوں کے اہم اور فوری توجہ طلب مسائل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ الٹا مظلوم مزارعین کو انتشار پسند، باغی اور بدمعاش قرار دیتے ہوئے انہیں کچلنے کی کوشش کی ہے ایوب خان یا یحییٰ خان سے تو کوئی بہتر توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کیوں کہ یہ دونوں پاکستان کے خود ساختہ، غاصب، مطلق العنان، آمر حکمران اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے نمائندے تھے لیکن قائد عوام اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت بھی ابھی تک صوبہ سرحد کے کسانوں کے مسائل کا کوئی خاطر خواہ حل تلاش نہیں کر سکی۔ حالانکہ اپنے منشور کی رو سے اس سیاسی جماعت کو برسراقتدار آنے کے بعد ملک سے سامراجی اثر ورسوخ ختم کرنا تھا اور پاکستان کے دکھیا غریب عوام کو جاگیرداری اور سرمایہ داری کی لعنتوں سے نجات دلا کر ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں ایک انسان دوسرے انسان کی محنت کو اپنے منافع کا ذریعہ نہ بنا سکے۔

منڈی کے کھیتوں سے شروع ہونے والے ظلم وستم کی آگ کے شعلے چارسدہ، ہشت نگر، شاہی بالا۔ ٹیلہ بند، ڈنگولہ، ہریانکوٹ، شیر گڑھ، کوپر، جانکو، بہرام ڈیری ظلم کوٹ، خیر آباد، رستم، جوڑ و بانڈہ، سیفور، دیر سوات چترال، ہتھیاں، چکدرہ، اور سرسدہ وغیرہ کی کسان بستیوں کے مزارعین اور خاکستر کرتے ہوئے اب مالاکنڈ تک پہنچ چکے ہیں۔ آج کل تشدد کے بھیانک سائے اس علاقہ کے کسانوں کے سر پر بری طرح منڈلا رہے ہیں۔ اور یہ امر وحشیانہ ظلم وستم کا ہی قدرتی اور فطری نتیجہ ہے کہ خوانین کے جبر و تشدد کا مچایا ہوا اندھیر جس طرف رخ اختیار کرتا ہے سیاہ رات کے اندھیاروں میں کسان تحریک کے ... بھی اس علاقے میں جل اٹھتے ہیں۔ کسان تحریک ... محنت کش عوام کو انتشار پسند اور بدمعاش قرار دینا اور گردن زدنی کے سزا وار ٹھہرانا حق وانصاف کا شعار نہیں ہے

سرحد کی موجودہ حکومت کے سربراہ مسٹر اسلم خٹک پاکستان کے چوٹی کے سرمایہ دار اور صوبہ سرحد کے بہت بڑے خان جنرل حبیب اللہ خان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ قائد عوام نے برسراقتدار آتے ہی ملک کے بڑے سرمایہ داروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ غیر ممالک کے بنکوں سے پاکستان کے عوام کا نچوڑا ہوا خون واپس لے آئیں انکار پر بعض سرمایہ داروں کو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ گرفتار ہونے والی تین بڑی شخصیتوں میں ایک جنرل حبیب اللہ بھی تھے۔ جنرل صاحب کو چند دن کے لئے ہری پور جیل میں آرام فرمانے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں نامعلوم وجوہات کی بنا پر انہیں رہا کر دیا گیا تھا۔ خیر یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی۔ گذشتہ دنوں مالاکنڈ میں ایک ایسے صاحب بہادر کو پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا ہے جو نہ صرف بذاتِ خود بڑے خانوں میں سے ہیں۔ بلکہ محنت کشوں کو کچلنے کے لئے بھی ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ اپنے علاقے میں مطلق العنان شہنشاہ کی سی حیثیت رکھتا ہے اسے عوام کی زندگی، موت اور آزادی سے متعلق خاصے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مالاکنڈ کے پی اے کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ وہی ذات شریف ہیں جنہوں نے سوات کے غریب مزدوروں اور مظلوم عوام پر گولی چلوا کر سینکڑوں محنت کش افراد کو زمرد کی کانوں میں ہلاک اور زخمی کر دیا تھا۔ پاکستان مزدور کسان پارٹی کے جنرل سیکرٹری جناب شیر علی باچا نے تو یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ خوانین سرحد نے مبلغ چار لاکھ روپے بطور نذرانہ پی۔ اے موصوف کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔ مالاکنڈ کی فضاؤں میں پائی جانے والی دہشت اور خوف وہراس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۴ اور ۲۵ جون کی درمیانی شب کو ملیشیا اور لیوی کے چار ہزار سپاہیوں

نے پولیٹیکل ایجنٹ کی قیادت میں کوپر نامی گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ باقاعدہ مورچہ بندی کرکے پانچ میل کے علاقہ کو گھیرے میں لے لیا گیا اور پھر بلا وارنٹ کسان گھرانوں کی تلاشیاں لی گئیں۔ کسانوں کے گھروں سے کوئی غیر قانونی اور ناجائز چیز برآمد نہ ہوئی۔ لیکن پھر بھی اس گاؤں سے کسان تحریک کے پانچ ممتاز کارکنوں کو ملیشیا والے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے گرفتار شدگان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اُس کا ذکر بھی رُوح فرسا ہے۔

۱۶ ستمبر کو ملنے والی اطلاع کے مطابق مالاکنڈ میں دس ہزار کسانوں کا اجتماع ہوا۔ تاکہ خانوں اور اُن کے تابعدار سرکاری اہل کاروں کے رویّہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاسکے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ پاکستان کے کسی اخبار میں خبر تک بھی نہیں چھپی۔ ایک طرف خوانین اپنے پالتو غنڈوں اپنی پناہ میں لئے ہوئے مفرور مجرموں کے ذریعہ کسانوں کو جبراً اور غیر قانونی طور پر زمینوں سے بے دخل کر دیتے ہیں پولیس، ملیشیا، لیوی اور سرکاری مشنیری ان کی حمایت کے لئے ہمیشہ مستعد رہتی ہے۔ دوسری طرف یہی خوانین اور اُن کے حواری شور مچا دیتے ہیں کہ صوبہ سرحد میں کسانوں نے بغاوت کر دی ہے جاگیرداروں کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے کسان زمینداروں کو بٹائی کا حصّہ دینے سے انکاری ہیں۔ دراصل خوانین انتہائی مکاّری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے پاکستان کے عوام کو دھوکے میں رکھ کر اپنے جرائم کی پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ خوانین سرحد کسانوں کے معاملہ میں "بدنام کرو اور مارو" کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں ان کا ہتھکنڈے مقصود یہ ہے کہ کسی طرح پاکستان کی مرکزی ریاستی قوت اور کسانوں میں تصادم کرا کے ان مظلوموں کا قلع قمع کرا دیا جائے خوانین کی یہ مذموم کوششیں متعدد بار منظر عام پر آچکی ہیں اسی غرض سے خوانین کسانوں کو اشتعال دلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

صوبہ سرحد کے خوانین دائیں بائیں بازو کی تمام سیاسی پارٹیوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ نیپ کی قیادت پر تو واضح طور پر اُن کا قبضہ ہے : "زلمے پختون" بھی دراصل سرحد کے جاگیرداروں کی پرائیوٹ فوج ہے جس کے خانِ خاناں جناب ولی خاں سپہ سالار ہیں پختون زلمے کے تمام تر اخراجات خوانین سرحد ہی برداشت کرتے ہیں۔ سیاسی میدان میں وہ چاہے ایک دوسرے کے بظاہر کتنے ہی حریف کیوں نہ ہوں لیکن طبقاتی محاذ پر تمام جاگیردار اکٹھے ہیں۔ خوانین سرحد نے اپنے طبقاتی مقاصد کے حصول کے لئے اپنی ایک انجمن تحفظ حقوقِ زمینداراں بنا رکھی ہے ہر خان چاہے وہ کسی بھی سیاسی پارٹی کا رکن کیوں نہ ہو انجمن زمینداروں کا سرگرم کارکن ضرور ہے اِس انجمن کے پاس ظاہر ہے کہ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کرنے اور اُن کی تحریک کو کچلنے کے سوا اس انجمن کے اور کوئی اغراض و مقاصد نہیں ہیں خوانین اور سرحد کی انتظامیہ میں گہرے رشتے ہیں۔ خوانین کے اپنے ہی بھائی بند بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہیں خانوں کی انجمن تحفظِ حقوق زمینداراں کی کارگذاری اور اُن کی پروپیگنڈہ مشنیری کی اعلیٰ کارکردگی ہی کا کرشمہ ہے کہ ملک کے بعض ترقی پسند گروہ اور انقلابی دھڑے بھی صوبہ سرحد کی کسان تحریک کو ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں اور مظلوموں کی حمایت کرنے کی بجائے الٹا کسانوں کی عظیم جدوجہد کو "مہم جوئی" "معیشت پسندی" اور "بائیں بازو کی موقع پرستی" وغیرہ کے نام دینے میں پیش پیش ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا صوبہ سرحد کے کسانوں نے واقعی بغاوت کر دی ہے ؟ لیکن یہ کیسی بغاوت ہے کہ بیسیوں کسان شہید ہو چکے ہیں۔ آگ لگا کر کسانوں ہی کے گھروں کو جلایا گیا ہے اُن کا تمام اثاثہ لوٹا گیا ہے انہیں انہیں زمینوں سے جبراً بے دخل کرکے بے روزگاری کے جہنم میں جھونک دیا گیا ہے۔ کسانوں کی بیٹیوں کو یرغمال بھی بنایا گیا۔ کسان زادیوں کا اغوا تو صوبہ سرحد میں عام ہے کیا بغاوت بغاوت کا شور مچانے والے بتا سکیں گے کہ آج تک کتنے خوانین قتل کئے جاچکے ہیں جاگیرداروں کے کتنے عشرت کدوں کو آگ لگا کر بھسم کر دیا گیا ہے جاگیرداروں کی کتنی بیٹیاں کسانوں کی قید میں رہیں خوانین پر کتنی بار دھاوا بولا ہے ؟ حقائق جاگیرداروں کے واویلا کے بالکل برعکس ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہمیشہ خوانین ہی نے کسانوں کی بستیوں کا گھیراؤ کیا ہے انہیں پریشان کرنے اور اشتعال دلانے کی غرض سے کھلیانوں کو آگ لگائی ہے ان کے رستے بستے گھروں کو جلایا ہے زرعی پیداوار کی تقسیم سے قبل ہی خوانین کے آدمی کھلیانوں سے اناج کا ایک ایک دانہ اٹھا کر زبردستی لے جاتے رہے ہیں شاہی بالا میں کسانوں کے پندرہ گاؤں کی تباہی کا ذمہ دار کون ہے ؟ کیا ان سینکڑوں پریشان حال کسانوں نے اپنے گھرانوں کو خود آپ ہی برباد کر ڈالا تھا ؟ یا ان مظلوم اور معصوم لوگوں پر آسمانوں سے کوئی عذاب الٰہی نازل ہوا تھا ؟ صوبہ سرحد میں گھیراؤ اور جلاؤ کسان نہیں کر رہے تھے بلکہ جاگیردار اور خوانین یہ خطرناک شغل فرما رہے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر خوانین ایسا کیوں کر رہے ہیں ؟۔ اس کا سیدھا سا جواب ہے۔ صدیوں سے خوانین سرحد کی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی بالادستی قائم کئے ہوئے تھے۔ جاگیرداروں سے زمین حاصل کرنے کے لئے کسان ایک دوسرے پہ ٹوٹ پڑتے تھے کسانوں کو مرغوں اور بیٹروں کی طرح آپس میں لڑانا خوانین کا پسندیدہ اور روزمرہ کا مشغلہ تھا۔ جب جاگیرداروں کے غنڈے کسی کسان کو دھکے دے کر زمین سے بے دخل کرتے تھے تو ہمسائے کے کسان سر جھکائے اپنے کام میں معروف رہتے تھے کسانوں کی عورتیں اور معصوم بچے اور جوان لڑکیاں جاگیرداروں کے حجروں اور قلعوں میں بلا تنخواہ کام کرنے پر مجبور رہتیں۔ جاگیردار کسانوں سے بیگار لینے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے لیکن اب حالات بدل چکے ہیں زمانہ کروٹ لے چکا ہے محنت کش جاگ اُٹھے ہیں صدیوں سے جھکی ہوئی گردنیں سیدھی ہو گئیں ہیں۔ کسانوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا بند کر دیا ہے جاگیرداروں کے غنڈے کسانوں سے خوف کھانے لگے ہیں۔ کسانوں اور اُن کی عورتوں نے بیگار نہ کرنے کی قسم کھائی ہے "حقیر" انسانوں نے مندرجہ ذیل چار راہنما اصولوں کو اپنا لیا ہے۔

(۱) کسانوں کے تمام باہمی جھگڑے آپس میں طے کئے جائیں گے۔ آپس کا کوئی معاملہ تھانے، عدالت یا خان کے پاس ہرگز نہیں لے جایا جائے گا۔

(۲) ایک کسان دوسرے کسان کی زمین کسی خان

سے اجارے یا بٹائی پر نہیں لے گا۔ تاکہ کسی کسان بھائی کو بے دخل نہ کیا جاسکے۔

(۳) بیگار نہیں لی جائے گی۔ خان کے لئے کئے جانے والے ہر کام کا معاوضہ وصول کیا جائے گا۔ خانوں کو جرمانے اور نذرانے نہیں دیئے جائیں گے تمام جاگیرداری رسومات کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے گا۔

(۴) ایک کسان سب کے لئے اور سب کسان ایک کے لئے

یہ ہیں کسانوں کے وہ راہنما اصول جن کی بنا پر دیہات کی تمام آبادی یا تو دو واضح حصوں میں بٹ چکی ہے اور یا پھر بٹ رہی ہے ایک طرف کسان ہے دوسری طرف غیر کسان ہیں۔ ہر کسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسان تحریک میں عملی شمولیت اختیار کرے۔ ورنہ اُسے غیر کسان شمار کیا جاتا ہے۔ غیر کسان کو کسانوں کی حمایت اور مدد حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں۔

ساری دُنیا انقلابات اور بنیادی تبدیلیوں کی زد میں ہے ہر شئے تبدیل ہو رہی ہے لیکن صوبہ سرحد کے خوانین صدیوں پرانے پیداواری رشتوں کو طاقت کے بل بوتے پر جوں کا توں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ محنت کشوں اور کسانوں کو جبر و تشدد اور استحصال کی زنجیروں میں بدستور جکڑے رہنا چاہتے ہیں۔ خوانین کی معاشی، سیاسی اور سماجی بالادستی کو ایک فطری تبدیلی کا سامنا ہے۔ خوانین کے لئے وقت کا یہ اٹل فیصلہ ہرگز قابل قبول نہیں وہ وقت کے دھارے کے سامنے جبر و تشدد اور ظلم کا بند باندھنا چاہتے ہیں۔ جو اُن کے بس کی بات نہیں ہے خوانین اسی بوکھلاہٹ میں کسانوں پر حملے پہ حملہ کئے جارہے ہیں وہ کسانوں کو زمینوں سے جبراً بے دخل کرکے معاشی طور پر مفلوج کر دینا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ شاید اسی طرح تاریخ کے پہیے کو پیچھے کی طرف گھمایا جاسکے۔ مانا کہ خوانین سرحد وحشت و بربریت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن انہیں تاریخ کے اس سبق کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ:... کس کے روکے رکا ہے سویرا



نوشہرو فیروز | علی احمد میمن

مختارکار نے امدادی سامان اپنے حواریوں میں تقسیم کر دیا

امدادی سامان کی تقسیم میں بدعنوانیاں

ایک طرف سیلاب کا پانی ان انسانوں کی محنت و مشقت سے کاشت کی ہوئی لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ کی مالیت کی کھڑی فصلیں تباہ و برباد کر رہا تھا تو دوسری طرف انسان کے دل و دماغ کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ یہ بھی سوچ نہیں سکتا ہے کہ آخر اسے کرنا کیا پڑے گا۔ تیسری جانب افسر شاہی اس نازک گھڑی میں بھی اپنے پرانے دستور کے مطابق اپنا پیٹ بھرنے اور اقربا پروری جیسے ہتھکنڈے استعمال کرنے میں مصروف تھی۔ سیاسی پارٹیاں، الگ اپنے ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھیں۔ اور متاثرین پر اپنے سیاسی نظریے تھوپنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ تاجر اور دکاندار سوچ رہے تھے کہ ایسا وقت پھر کبھی نہیں آئے گا۔ قدرت کی طرف سے ان کے لئے یہ رحمت آئی ہے۔ جس طرح سید عبداللہ شاہ وزیر خوراک نے کہا تھا کہ یہ سیلاب تو قدرت کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ لہٰذا دکانداروں نے یہ طے کرلیا کہ جہاں تک ممکن ہوسکے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کی چمڑی اتار دی جائے۔ ایک ہی روز میں ان کو ساہوکار بن جانا چاہیئے۔ اس سوچ نے انہیں ہر چیز کی قیمت میں بے تحاشہ اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

اس علاقے کے امدادی کام کے لئے کالونائزیشن افسر سید بچل شاہ اور اسسٹنٹ کمشنر مسٹر محمد علی عباسی کو مقرر کیا گیا تھا جسے عوامی حکومت نے راشی ہونے کے الزام میں برطرف کر دیا تھا لیکن حال ہی میں جو افسران دوبارہ بحال ہوئے تھے۔ ان میں ان کو بھی بحال کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ پہلے اس افسر کے خلاف ہاریوں نے اسسٹنٹ کمشنر مورو کے دفتر کے سامنے لمبے دنوں تک بھوک ہڑتال کر دی تھی لیکن کہا جاتا ہے کہ افسر شاہی کے چند لوگوں اور پیپلز پارٹی کے چند کارکنوں نے ہاریوں کے موقف کو ناجائز قرار دے کر ہڑتال ختم کرا دی تھی۔ ان کے خلاف بڑی تعداد میں شکایتیں حکام کے پاس موجود ہیں لیکن چونکہ درخواستیں غریب لوگوں کی طرف سے ایک بہت بڑے زمیندار اور بڑے افسر کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ان پر کوئی توجہ نہیں دیجاتی ہے

سید بچل شاہ نوشہرو فیروز کا ہی رہنے والا ہے اور شہر مٹھیانی سے تقریباً دو میل دور دریائے سندھ کے کنارے ایک دیہات کا باشندہ ہے اور ایک اچھا خاصا زمیندار بھی ہے۔ لہٰذا اس علاقے، خصوصاً کچے علاقے کے تقریباً تمام لوگوں کو جانتے ہیں۔ موصوف جب اس تحصیل میں امدادی کیمپوں کے نگران ہوکر آئے تو ہر ایک نے یہ محسوس کیا تھا کہ اب متاثرین کو راشن کے معاملے میں کوئی پریشانی اٹھانی نہیں پڑے گی۔ بلکہ ہر حقدار کے ساتھ انصاف ہوگا۔ لیکن متاثرین کی یہ تمام امیدیں اس وقت خاک میں مل گئیں جب دیکھا گیا کہ سید بچل شاہ جیسے افسر بھی غلط ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئے۔

سید بچل شاہ اس علاقے کے زمیندار بھی ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کو جانتے ہیں، اس کے باوجود موصوف کے ہی ہاتھوں ایسے افراد کو امدادی سامان اور راشن دیا گیا جو اس کے حقدار نہیں تھے، یعنی وہ متاثرین میں سے

نہیں تھے اور ان لوگوں نے ادھر سے راشن لیا اور اسی وقت سرِ بازار فروخت کر دیا۔ متاثرین اور عام لوگ یہ منظر دیکھتے رہے۔ دیہہ گچھ کے متاثرین میں سے ایک شخص محمد صالح ملاح نے بتایا کہ سید بچل نے متاثرین کو راشن نہیں دیا ہے لیکن اپنے سیاسی دوستوں جیون پنہور، دھنگانو پنہور، بھائی خان پنہور، گل ماچھی، دھنگانو ماچھی، کھو کھر فقیر، میہر پنہور، صدیق چھجڑو اور کئی اور لوگوں کو راشن دیا ہے۔ جنہوں نے بازار میں کئی لوگوں کے سامنے اس راشن کو فروخت کر دیا۔ محمد صالح نے بتایا کہ محمد صدیق اس علاقے کا ایک زمیندار ہے جس کی زمین پکے میں ہے۔ اور سیلاب سے اس کی زمین کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ لیکن چونکہ سید بچل شاہ کے محمد صدیق سے پرانے مراسم ہیں، لہٰذا اس دوستی کی بنا پر یہ راشن جس پر اس کا کوئی حق نہیں تھا اسے دیا گیا۔ اس طرح شاہ صاحب نے اپنے دوستوں کو راشن سے نواز کر ایک طرف فرض ناشناسی کا مظاہرہ کیا اور دوسری طرف اقربا پروری کا بدترین مظاہرہ بھی کیا۔

نمائندہ "الفتح" شہر کنڈیارو میں متاثرین کے کیمپ کا معائنہ کرنے پہنچا تو دیکھا کے کیمپ کے اندر چند لوگ مقیم تھے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ مختارکار شوکت جوکھیو نے متاثرین پر ظلم روا کر رکھا ہے۔ متاثرین نے مختارکار پر الزام لگاتے ہوئے بتایا کہ اس نے امدادی راشن اپنے حواریوں کی معرفت شہر کے دکانداروں کو فروخت کر دیا جس کی تصدیق سندھی روزنامہ "عبرت" حیدرآباد مورخہ ۲۳-۹-۷۳ میں ہوئی ہے۔ جس میں نمائندہ عبرت نے کنڈیارو کیمپ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

مزدور کسان پارٹی کے سرگرم کارکن نے بتایا، کہ پیپلز پارٹی کے کارکن لوگوں کو گھی کی سلپ دیتے ہیں جب اس شہر میں گھی آتا ہے تو پیپلز پارٹی کے کارکن گھی کی ایک خاص مقدار علیحدہ مخصوص کروا لیتے ہیں اور دکاندار صرف ان لوگوں کو گھی دیتے ہیں جن کے پاس پیپلز پارٹی کے اس گروہ کے لوگوں میں سے کسی ایک کی دی ہوئی سلپ موجود ہو۔

شہر بھریا میں سیلاب سے متاثرین کے لئے دو کیمپ قائم کئے گئے تھے۔ لیکن ان میں متاثرین میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ البتہ ڈاکٹر موجود تھا۔ کیمپ میں متعین لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ متاثرین کے لئے ملی ہوئی دواؤں کا کچھ حصہ ڈاکٹر صاحب نے فروخت کر دیا ہے۔ اور کچھ دوستوں میں تقسیم کر دیا اور تقسیم کے جعلی بل تیار کرائے گئے۔ یہ شکایت بھی عام تھی کہ ہیضے کے ٹیکے لگانے والے شہروں میں چکر لگا کر وقت پورا کر رہے ہیں، لیکن سیلاب والے علاقوں میں بالکل نہیں جاتے۔ شہر ٹھارو شاہ کے ایک کیمپ میں مقیم ایک شخص محمد راہب عالمانی نے جو محکمہ آبپاشی خیرپور گنبو سب ڈویژن میں دارو غہ ہے، بتایا کہ جن کشتیوں میں وہ اپنے معصوم بچوں اور مستورات کے ساتھ آیا تھا۔ ان کشتی والوں نے ان سے دستور سے تین اور چار گنا زائد رقم وصول کی تھی۔ علاوہ ازیں جب وہ کشتیوں سے اترے تو وہاں کھڑی پولیس نے ان سے اناج اور مرغیوں تک لے لیا تھا۔ احتجاج کرنے پر ان سے بدسلوکی کی جاتی تھی اسی کیمپ کے ایک اور شخص قابل کاکانی نے بتایا کہ وہ قصبہ ہمندر خان عالمانی دیہہ کوٹ ستا بو تحصیل مورو کا رہنے والا ہے۔ ان کا قصبہ پرفی کے بالکل قریب ہی جہاں شگاف پڑا تھا۔ اس نے آبدیدہ ہو کر بتایا کہ سیلاب کے پانی نے اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنا ضروری سامان نکال سکتے۔ اس نے بتایا کہ آٹھ سو روپیہ مالیت کا، ایک بیل پانی کی نذر ہو گیا۔

قابل عالمانی نے مزید بتایا کہ جب وہ یہاں کیمپ میں آیا تھا تو اس کا ایک بیل چوری ہو گیا۔ بیل کی قیمت تقریباً نو سو روپیہ تھی، پولیس نے اس کی فریاد داخل، کرنے سے انکار کر دیا، اور اس کے زیادہ اصرار پر اسے بے عزت کر کے پولیس تھانہ سے باہر نکال دیا تھا۔

اسی کیمپ کے ایک شخص حاکم عالمانی نے انتظامیہ پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ ہم جب کہتے ہیں کہ جانی نقصان ہوا ہے تو انتظامیہ دھمکیاں دیتی ہے کہ اگر زبان بند نہ کی تو تمہاری خیر نہیں اور تمہاری تمام امداد بند کر دی جائیگی

ٹھارو شاہ کے شہریوں نے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ پیپلز پارٹی کے ورکروں کو جب سیلاب کی شدت کا احساس ہوا تو وہ فوری طور پر حرکت میں آگئے اور انہوں نے پیپلز پارٹی کے صدر کی رہنمائی میں ہزاروں روپیہ چندہ اکٹھا کیا۔ اس کے علاوہ امدادی سامان بھی جمع کیا۔ اس کے بعد انہیں کسی بچاؤ بند یا کسی کیمپ میں نہیں دیکھا گیا اور انہوں نے الزام لگایا کہ تمام رقم انہوں نے ہضم کر لی۔

بقیہ • جواب آں غزل

پی ایف یو جے کے ساتھ نئی حکومت کے پہلے وزیرِ اطلاعات جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کا رویہ انتہائی قابلِ تعریف تھا انہوں نے مختصر سی مدت میں بہت سے نیک کام کئے لیکن جب انہیں ہٹا کر مولانا کوثر نیازی کو وزیرِ اطلاعات بنایا گیا تو پی ایف یو جے نے کسی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ وزیر بنانا یا وزیروں کو ہٹانا پی ایف یو جے کا کام نہیں۔ بعینہٖ نیشنل پریس ٹرسٹ کے متعدد چیئرمین برسرِ اقتدار آئے۔ پی ایف یو جے مسلسل ٹرسٹ کو توڑنے کا مطالبہ کرتی رہی۔ البتہ اگر کسی چیئرمین نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے پی ایف یو جے دشمنی ... پریس دشمنی یا عوام دشمنی کا ثبوت دیا تو پی ایف یو جے نے اس کے مخصوص اقدامات کی ضرور مخالفت کی۔ اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، اس لئے اگر اپنی کارگزاریوں کی وجہ سے شیخ صاحب کو ٹرسٹ سے علیحدہ کیا جائے یا انہیں یونس سعید صاحب کی طرح مستعفی ہو جانے پر مجبور کیا جائے تو اس میں پی ایف یو جے یا اس کے عہدہ داروں کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔

ٹرسٹ کے چیئرمین نے اپنے خط میں ۱۹ ستمبر کی ملک گیر احتجاجی علامتی ہڑتال کو بے وقت اور بے وقعت اور مہم جوئی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ یہ بھی ان کا اپنا مفروضہ ہے۔ مہم جوئی اور جلد بازی کی مرتکب پی ایف یو جے یا اس کے عہدہ دار نہیں بلکہ خود اولاً حکومت ہے اور ثانیاً وزیرِ اطلاعات اور ٹرسٹ کے چیئرمین ہیں۔ حکومت

اس لئے کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے ایک نادرشاہی حکم کے ذریعے ایک چھوڑ تین تین روزنامے ہنگامی اور غیر جمہوری قوانین کے تحت اس وقت بند کئے جب وزیراعظم کے امریکہ کے تاریخی دورہ کے آغاز میں صرف دس بارہ دن رہ گئے تھے۔ وزیراعظم کو ایک ایسی حالت میں امریکہ بھجوانا کہ ان کی موجودگی میں تین تین روزنامے اور وہ بھی حزبِ اختلاف کے نقطۂ نظر سے تعلق رکھنے والے بند کر دیئے گئے ہوں اور ان کے ایڈیٹروں کو جیل بھیج دیا گیا ہو اور انہیں ہتھکڑیاں پہنائی گئی ہوں۔ کہاں کی دانش مندی ہے جناب یہ مہم جوئی اور عجلت پسندی پی ایف یو جے نے کی یا حکومت نے

پھر اس سے بڑی مہم جوئی کا ارتکاب خود وزیرِ اطلاعات اور شیخ صاحب نے کیا کہ انہوں نے کسی اختیار کے بغیر پی ایف یو جے، اے پی این ایس اور سی پی این ای کے سربراہوں اور ٹرسٹ کے جملہ ایڈیٹروں کی موجودگی میں یہ غیر مشروط یقین دہانی کرائی کہ اگر پی ایف یو جے اپنی ۱۵ ستمبر کی ہڑتال ملتوی کر دے تو وہ دو دن کے اندر اندر تینوں اخبارات سے پابندی ہٹوا دیں گے اور ان کے ایڈیٹر رہا ہو جائیں گے۔ بغیر کسی اختیار کے اس قسم کی یقینی دہانی کرانا غیر ذمہ داری، مہم جوئی اور جلد بازی کی انتہا ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ دونوں حضرات پی ایف یو جے کو داد دیتے کہ اس نے ۱۵ ستمبر کی ملک گیر ہڑتال کو ان کی یقین دہانی پہ ملتوی کر دیا اور اس طرح انتہائی بردباری تحمّل اور صلح جوئی کا ثبوت دیا لیکن نہیں انہوں نے اسکے برعکس یہ طے کر لیا کہ پی ایف جے پر اتہام تراشی کریں اور ۱۹ ستمبر کی ہڑتال کو ناکام بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں۔ ہڑتال ان کی ان تمام مساعی کے باوجود، کامیاب رہی اور اگر بعض مقامات پر پولیس کی حماقت اور دھونس اور دھمکی کے نتیجہ میں مالکان اخبارات نے بھاڑے کے آدمیوں سے چند چیتھڑے نکال لئے تو اس سے ہڑتال ناکام ثابت نہیں کی جاسکتی۔

تباہی اور بربادی سے اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہ مل کر پی ایف یو جے کے سرگرم کارکنوں یا دوسری ایمپلائز یونینوں کے عہدہ داروں کے خلاف انتقامی، کارروائیاں کر رہے ہیں، بعض کے خلاف کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بھی وہ خود ہی ذمہ دار ہوں گے — یادش بخیر، ۱۹۷۰ء کی دس روزہ کامیاب ہڑتال کے وقت یحییٰ شیر علی حکومت، اس کے زرخرید مالکان اخبارات اور بھاڑے کے چند رجعت پسند اخبار نویس بھی یہی کہتے تھے کہ پی ایف یو جے نے تباہ کر دیا۔ اگر کوثر نیازی صاحب اور حامد محمود صاحب، جنرل یحییٰ اور شیر علی اور انکی حامی سیاسی جماعتوں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو بسم اللہ۔ انشاءاللہ جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ صرف وقت کی بات ہے۔

شیخ صاحب کچھ وعظ کرنے کے زیادہ ہی قائل معلوم ہوتے ہیں اور بار بار اپنی بزرگی اور ہم سب کی نوجوانی کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بزرگی یا کہنہ سنی کے اپنے فوائد ہوتے ہیں لیکن کوئی بزرگ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ "بزرگی بہ عقل است نہ کہ بہ سال"۔

رہ گئی بے راہ تحریروں اور بے تکی خبروں کی بات تو یہی عرض ہے کہ صاحب یہ کون طے کرے گا کہ فلاں تحریر بے تکی یا بے راہ ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک "شہاب" کے مندرجات اب بھی اتنے ہی بے تکے، بے راہ اور قابلِ اعتراض ہیں جتنے وزیر اطلاعات اور شیخ صاحب کے نزدیک جسارت، ہیران اور حریت (سابق) کے مضامین یا خبریں۔ فرق یہ ہے کہ ان حضرات کے پاس طاقت ہے اس لئے یہ اپنی بات ہی کو صحیح سمجھتے ہیں اور اسی لئے پنجاب پنچ اور فرنٹیئر گارڈین پر پابندی لگ سکتی ہے۔ اور الفتح کا نیوز پرنٹ کوٹہ منسوخ ہو سکتا ہے، لیکن ہفت روزہ شہاب پر کوئی آنچ نہیں آسکتی کیوں آئے، سیاں بنے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔

اس وقت وزیر اطلاعات اور ٹرسٹ کے چیئرمین صاحب بزعمِ خود اپنی "فتوحات" کے نشے میں چور ہیں، وزیر اطلاعات کچھ زیادہ کہ وہ پاکستان کے تمام اخباروں میں روزانہ صفحہ اوّل پر اپنی تقریریں پڑھ کر اور اپنی تصاویر دیکھ کر اور ریڈیو اور ٹی وی سے اپنی نظمیں اور نعتیں سن کر مست الست ہو جاتے ہیں اور اس پر فخر کر رہے ہیں کہ اس عوامی دور میں انکی وزارت اور چیئرمینی کی سربراہی میں اخبار پر اخبار بند کئے جا رہے ہیں یا ان سے معافی منگوائی جا رہی ہے اور کان پکڑوائے جا رہے ہیں۔ کسی کے اشتہار بند ہیں تو کسی کا کاغذ کا کوٹہ، ایک دار و گیر کا عالم ہے۔ اور وہ پی ایف یو جے کو ایک دن کے لئے علامتی ہڑتال بھی کرنے نہیں دیتے۔ بلکہ منصوبے یہ ہیں کہ کچھ توڑ جوڑ، کچھ داد و دہش کر کے پی ایف یو جے کو ختم کیا جائے یا اس کا کردار ہی بدل دیا جائے۔ لیکن میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ بھائی تاریخ سے سبق لیجئے، اب بھی وقت ہے۔

یہاں میں چلتے چلتے اُس منصوبے کا ذکر بھی کر دوں جو زبانی طور پہ سنا جا رہا ہے۔ یعنی یہ کہ وزیر اطلاعات صاحب وزیراعظم کے نام سے صحافیوں کی ایک "کانفرنس" طلب کر رہے ہیں جو وزیر اطلاعات کی "پسند" اور "خواہشات" کی نمائندگی کرے گی، عامل صحافیوں یا پریس ورکروں کی نمائندہ نہیں ہو گی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ پریس کے مسائل پہ بات چیت کرنے کے لئے عامل صحافیوں کی نمائندہ جماعت پی ایف یو جے، ایڈیٹروں کی جماعت سی پی ایس ای اور مالکان کی جماعت اے پی این ایس اور متعدد ایمپلائز یونینوں کے منتخب نمائندوں کو طلب کر کے ان سے مذاکرات کئے جاتے لیکن وزیر اطلاعات صاحب ہٹلر اور گوئبلز کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش فرما رہے ہیں کیونکہ نازی ازم اور فاشزم کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ جمہوری اور نمائندہ تنظیموں کو توڑ دیا جائے یا انہیں نظر انداز کیا جائے۔ اور انفرادی طریقہ کار اختیار کیا جائے۔

لیکن اس بارے میں بھی یہی عرض ہے کہ قبلہ یہ ۱۹۳۰ء یا ۱۹۴۰ء نہیں بلکہ ۱۹۷۳ء ہے۔ آپ کیوں سعیٔ لاحاصل میں مبتلا ہیں۔ نہ غلط مشورے سنیئے نہ غلط مشورے دیجئے۔ اور صراطِ مستقیم کو پکڑنے کی کوشش کیجئے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ آپ خود "سبز مائل" تصوّر فرماتے ہیں۔